هندوستان: ماضي اور حال

الهند: قديما وحديثا

گورنمنٹ گرلز جنرل ڈگری کالج

۷، میور بھنج روڈ، کولکاتا-۷۰۰۰۲۳

بھارت

INDIA: PAST AND PRESENT
الهند: قديما وحديثا
هندوستان: ماضي اور حال

INDIA:

PAST *AND* PRESENT

Government Girls' General Degree College
7, Mayurbhanj Road, Kolkata-700023
INDIA

ہندوستان: ماضی اور حال

الهند: قديما وحديثا

گورنمنٹ گرلز جنرل ڈگری کالج

۷ رمیور بھنج روڈ، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۲۳

بھارت

فہرست/المحتویات

		الصفحة
۱	امیر خسرو: گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ـــ ڈاکٹر سیدۃ شارۃ المولیٰ القادری	3
۲	ساحر لدھیانوی: اپنے افکار کے دریچے سے ـــ ڈاکٹر شبانہ نسرین	13
۳	مولانا جلال الدین محمد بلخی اور ان کا فلسفہ ـــ ڈاکٹر شاہد جمیل	29
۴	قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' میں اشترا کی لہر ـــ ڈاکٹر شبنم پروین	38
۵	افسانہ 'بے حسی': ایک جائزہ ـــ ڈاکٹر محمد محسن خان	47
۶	بنگال میں سلسلۂ قادریہ کی آمد اور ان صوفیوں کی ادبی خدمات ـــ ڈاکٹر سیّد شاہ ومیق الارشاد علی القادری	55
۷	خواجہ احمد عباس کی صحافتی زندگی ـــ ڈاکٹر نکہت پروین	70
۸	مجنوں گورکھپوری اور ان کے افسانوں میں رومانیت کا تصور ـــ ڈاکٹر زاہدہ پروین	78
۹	علامہ سیماب 'لوح محفوظ' کے آئینے میں ـــ ڈاکٹر رضا مظہر انصاری	87
۱۰	العلامة فضل حق الخیر آبادی: شخصیته متعددة الجوانب ـــ د. شفیق الاسلام	101
۱۱	الاستاذ المعصومي: شاعرا مجیدا ـــ د. محمد صدر الاسلام	109

امیر خسرو گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار

ڈاکٹر سیدہ شارقۃ المولی القادری
پرنسپل، گورمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کلکتہ

Abstract:
Ab'ul Hasan Yamīn ud-Dīn Khusrow, better known as Amir Khusro was an iconic figure in the cultural history of South Asia. He was a Sufi poet, musician, philosopher, scholar and a patriot par excellence. He was born in 1253 A.D in Patiyali, Uttar Pradesh. He became well versed in the Turkish, Persian and Arabic languages and also acquired proficiency in various Indian dialects in the multi-ethnic environment of Delhi. He primarily wrote poetry in Persian and also in Hindavi. He composed his first Diwan 'Tuhfa-tus-Sighr' between the age of 16 and 19. An expert of multiple styles of Persian poetry, he has written more than four Lakh verses. He is credited with enriching the Hindustani classical music by introducing Arabian and Persian elements in it and was the originator of tarana and Khayal style of music.

Khusraw became a spiritual disciple of Hazrat Nizamuddin Auliya at a tender age. His spiritualism, in fact, consisted in his philosophy of love and humanism which he acquired from his spiritual guide. Khusro's humanism transcended all barriers of cast, creed and colour. His poetries are the best example

of humanism brotherhood and love.

Khusrau was a very prolific author and poet of rare distinction. He wrote on a variety of subjects include patriotism. According to Ziauddin Barani "there is not a single work of his without any reference to India. He had deep love and affection for India, its tradition, its culture, its arts and crafts, Indian land, its fruits and flowers, Indian Philosophy, Indian music and Indian languages.

انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں سیکڑوں نام ایسے ملیں گے جنھوں نے اپنی قابلیت سے اپنا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنے جذبۂ ایجاد کے بل پر اپنے ہم عصر پر ہی نہیں بلکہ ہر زمانے پر فوقیت حاصل کی۔ ایسی ہی جامع شخصیت ابوالحسن یمین الدین خسرو کی بھی ہے۔

دیباچہ غزۃ الکمال کے مطابق حضرت امیر خسرؔو کی ولادت باسعادت یکم / محرم ۶۵۱ھ مطابق ۳ مارچ ۱۲۵۳ء آگرہ کے قصبہ پٹیالی میں ہوئی۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود جوتر کی النسل تھے بیشمار خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن کا شمار ہزارہ بلخ کے امراء میں ہوتا تھا۔ چینگیز خان کے حملوں سے تنگ آ کر ہندوستان آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ہندوستان کو اپنا مسکن بنالیا۔

حضرت امیر خسرؔو کا شمار فارسی اور اُردو کے عظیم المرتبت ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انکو مختلف علوم وفنون پر عاملانہ دسترس حاصل تھی- وہ بیک وقت عالم باعمل، صوفی باکمال، عظیم شاعر، مفکر، فلسفی، بے مثال موسیقی کار اور ادیب کامل تھے۔ اُردو زبان وادب کے پہلے شاعر بھی تسلیم کئے جاتے ہیں انہون نے اپنے فکر وفن اور خُداداد صلاحیتوں سے اپنے عہد کو بڑا متاثر کیا اور آج بھی لوگ اُن کی

شخصیت اور شاعری کے مداح ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی امیر خسرو کی جامعیت کمالات پر تبصرہ کرتے ہوے کہتے ہین کہ" ہندوستان میں ۶۰۰ برس مین اب تک اس درجہ کا جامع کمالات نہین پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر گونا گوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت مین دو چار ہی پیدا کے ہونگے۔" [شعرالعجم حصہ دوئم، ص ۱۰۸]

خسرو فارسی، اُردو اور رائج الوقت زبانوں میں دستگاہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے وقت کی 5 زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ خسرو کا مولد پٹیالی تھا جہان کی زبان برج بھاشا تھی۔ لیکن خسرو اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں۔ دیباچہ غزۃ الکمال مین کہتے ہین کہ" ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم چون آب" [مین ہندوستانی ترک ہوں اور ہندوی پانی کی طرح بولتا ہوں وحید مرزا: ص ۳۹] اُردو اور ہندوی کے علاوہ اُنھوں نے فارسی میں کم وبیش پانچ لاکھ اشعار تخلیق کئے ہیں۔ غزل آپ کی محبوب صنف سخن تھی مگر انھوں نے دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور کئی اہم تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہین جو فارسی، اُردو اور ہندی زبان کا قدیم انمول ادبی خزانہ مانا جاتا ہے۔

آپ کی شاعری عشق حقیقی کی آئینہ دار ہے اور آپ کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ [میر خورد، ص: ۳۰۱]

آپ کے کلام میں فصاحت و بلاغت، سادگی، تسلیم و رضا ادب و احترام پایا جاتا ہے۔ نادر تشبیہات، والہانہ جذبات، لطافتِ زبان و بیان اور شیریں کلام، فلسفیانہ، حکیمانہ اور صوفیانہ افکار اپکی شاعری کے مخصوص رنگ ہیں۔

امیر خسرؔو'' سلطان اور سیاست'' سے بھی وابستہ رہے اور کئی عوامی خدمات بھی

انجام دیں۔ آپ نے گیارہ بادشاہوں کا دورِ حکمرانی دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت میں رہے۔ سبھی حکمران آپ کی شخصیت اور شاعری کے بڑے مداح تھے۔

حضرت امیر خسروؔ نے طویل عمر پائی اور اپنی تمام عمر زبان وادب کی خدمت میں، اعلیٰ علمی روایات اور شاعری کو پروان چڑھانے میں صرف کردی۔ آپ کے شاگردوں، دوستوں اور چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ت※ا جس میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔

امیر خسروؔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (محبوب الٰہیؒ) کے دست گرفتہ مرید تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے زمانے کے جید عالم باعمل، صوفی باکمال اور روحانی پیشوا گزرے ہیں۔ آپ کی روحانی تعلیمات بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست پر لگانے اور بندے کو مولا سے ملانے کا کارگر وسیلہ ہوتین تھین۔ ضیاالدین برنی کے مطابق حضرت نظام الدین کا روحانی اثر بہت وسیع تھا۔ سبھی طبقے کے لوگ آپ کے ارادت مندوں مین شامل تھے۔ یہاں تک بادشاہ بھی اپنی پریشانیوں کے وقت آپ کی خانقاہ میں حاضری دیتے۔ خسرو بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے۔ جو حضرت نظام الدین کی بزرگی کے معترف اور ان کے فیضِ صحبت سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کو اپنے پیر و مُرشد سے گہری عقیدت تھی۔ حضرت نظام الدین بھی خسرو کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ حضرت نے امیر خسرو کو خاص تربیب سے نوازا اور ان کو تصوف کے رنگ میں اس طرح رنگ دیا کہ اُن کی شاعری اور اُن کا ہر فعل اللہ اور اپنے محبوب و پیر و مرشد کی رضا جوئی کے لئے ہوتا۔۔ یہ شیخ کی تعلیم و تربیت و نگہداشت کا اثر تھا کہ امیر خسروؔ تعلیم و تربیت، اخلاق وحُسنہ، زہد و تقویٰ اور دوسرے علوم میں کامل بن گئے اور انہون نے اپنی ساری زندگی زہد و تقویٰ، خدمت خلق مین گزاری۔ [سید صباح الدین ص:۱۲۸۔ ۱۳۳] اپنے بارے میں خود کہتے ہیں کہ۔

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اُنھوں نے اپنے کلام سے بھٹکی ہوئی انسانیت کوراہِ راست پر لگانے کی کوشش کی جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔اُنکی تعلیمات سے انسانیت کا درس ملتا ہے۔اُن کی تعلیمات اورانکا پیغام آپسی بھائی چارہ، خدمت خلق اور محبت کو عام کرتا ہے[نہ سپہر،ص:۲۹-۲۵۱]

حضرت امیر خسرؔو نے ادب اور شاعری کے علاوہ سماجی زندگی میں مشترکہ روایات اور جذباتی ہم آہنگی کوفروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ اپنی خوشمزاجی، فراخ دلی اورملنسارطبیعت کی وجہ سے اپنے زمانے میں ہردلعزیز تھے-وہ لوگوں کے دلوں کوموہ لے نے کا فن جانتے تھے۔انہیں معلوم تھا کہ کس شخص سے کس طرح بات کی جائے تا کہ سامع کی رسائی گفتگو کی روح تک ہو۔انکی باتوں سے اور انکی شاعری سے بچے بوڑھے،امیرغریب،مردعورت،شہری دیہاتی، ہندومسلم غرض کہ ہرکوئی متاثر تھا

عوام الناس میں جوشہرت انھیں حاصل تھی وہ ان کے ہندی کلام کی وجہ سے بھی تھی۔اُس دور میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان ہوا کرتی تھی اور ہندوی عوامی زبان تھی جو دھلی کے اطراف میں سبھی لوگ بولتے اور سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو اج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔خسرو کے تمام ہندوی کلام جوکھڑی بولی اور برج بھاشا کا آمیزہ ہیں زبانی روایات یا سماجی روایات کے زمرہ میں شامل ہیں۔مگرافسوس کہ امیرخسرو نے اپنے ہندوی کلام کوکبھی جمع نہیں کیا بلکہ دوستوں میں تقسیم کردیا۔ان کا ہندوی کلام جوکچھ ہم تک پہنچا ہے وہ یا تو بعض شاگردوں کی بیاضوں کی بدولت یا زبانی روایت کے ذریعے سب سے پہلے سب رس کے مصنف نے امیرخسرو کے دوہے کواپنی کتاب میں نقل کیااورانکے ہندوی کلام کی تحریر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر ۱۹۱۸ میں علی گڑھ سے ایک مجموعہ ''جواھرخسروی'' کے نام سے شائع ہوا جس کے

مرتبین مولانا محمد امین چڑیا کوٹی اور مولانا رشید احمد سالم ہیں۔ یہ مجموعہ خسرو کے ہندوی کلام پر مبنی تھا۔[وحید مرزا،ص:۳۶۹]

ان کے ہندی کلام کے لئے اوحدی "تزکرہ عرفات" میں یوں رقمطراز ہیں انکا ہندی کلام فارسی کلام سے بھی زیادہ ہے۔[شعرالعجم جلد دوم ص: ۱۱۳]

خسرو نے اس کی نمائندگی کیلئے ہندوی انداز ہی نہیں بلکہ زبان و بیان، طرز اور لہجے، الفاظ ومحاورے سبھی ہندوی سے حاصل کئے۔انہوں نے ہندوی شاعری کو فارسی بحورو اوزان کا لباس عطا کیا۔ان کے اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو کلچر ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں اور ان دونوں کے آپسی اتحاد کی وجہ سے تیسرے کلچر کی بنیادیں مستحکم ہورہی ہیں۔ان دو زبانوں کی آمیزش کو اردو کے شاعروں نے ریختہ کا نام دیا۔انکے چند اشعار ملاحضہ فرمائیں۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بتائے بتیاں

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہوے کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں، دراز چوں زلف، وروز وصلش، چوعمر کوتاہ

سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں، اندھیری رتیاں

چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

[شاھد مختارص:۶۲]

پھر ایک جگہ یوں کہتے ہیں کہ۔:

اری اری ہمہ بیاری اری　　ماری ماری برہ کہ ماری اری

[وحید مرزا ص:۲۵۰]

امیر خسرو نے ہندوستان کی سرزمین پر سب سے پہلے سماجی رواداری، بھائ چارگی اور آپسی ملاپ کے ورثے کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا، انکا فطری رجحان ہمیشہ ہندوستانی سماج کی ہندوی روایات اور مسلم معاشرے کی اسلامی خصوصیات کو علحدہ کرنے کے بجائے ان دونوں میں اشتراک قائم کرنے کی طرف تھا۔ جس کا ثبوت انکی پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انمیلیوں اور دوسخنوں میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ زیل پہلی میں دونوں قوموں کا ذکر کرتے ہوے کہتے ہیں کہ۔

گھوم گھومیلا لہنگا پہنے ایک پاؤں سے رہے کھڑی
آٹھ ہاتھ ہیں اس ناری کے صورت اسکے لگے پری　[چھتری]

سب کوئ اسکی چارہ کریں مسلمان ہندو چھتری
خسرو نے یہ کہی پہلی دل سے اپنے سوچ زری

انکے دوہے بھی پہلیون کی طرح گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

شیام سیت گوری لے جنمت بھئی انیت　　ایک پل میں پھر جات ہیں جوگی کا کے میت

خسرو پاتی پریم کی بیرلا بانچے کوئے　　وید قرآن پوتھی پڑھے پریم بنا کا ہوئے

[شاھد مختار ص:۶۸]

انکے دوہے جہاں انکے جزبات اور دلی کیفیات کے ترجمان ہیں وہان ہندوستانی سماج کے مروجہ رسومات اور ریت رواج کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔مثلا مندرجہ ذیل دوہامیں ستی کی رسم کواس انداز سے پیش کیا ہے کہ۔

خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوئے　　پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئے

انکے دوہوں کی طرح انکی کہ مکرانیاں بھی عوام میں بیحد مقبول ہیں جن میں کچھ ایسی بھی ہیں جن میں جا بجا ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے اندر مذہبی بھید بھاؤ بالکل نہیں تھا۔مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ

آٹھ انگل کا ہے وہ اصلی　　اسکی ہڈی نہ اسکی پسلی

لٹا دھاری گرو کا چیلا　　اے سکھی ساجن نا سکھی کیلا

[شاھد مختار،ص:۵۷]

شیام برن اور دانت انیک لچکت جیسے ناری۔دونوں ہاتھ سے خسرو کھینچے اور یوں کہے تو آری اسی ضمن میں خسرو کا وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء اپنے بھانجے تقی الدین کے انتقال کے بعد بہت غمگین رہنے لگے تھے جن سے وہ بیحد محبت کرتے تھے۔امیر خسرو سے آپکی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ایک دن خسرو راستہ سے گزر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ کچھ ہندو ڈھول اور منجیرا لئے بسنتی لباس پہنے ہاتھوں میں سرسوں کا پھول لئے گاتے بجاتے چلے جا رہے ہیں۔خسرو نے انسے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ انہونے جواب دیا آج بسنت کا تہوار ہے اور وہ اپنے خدا کو سرسوں کے پھول کا تحفہ پیش کرنے کا لکا مندر جا رہے ہیں۔خسرو کو یہ انداز بے حد پسند آیا اور انہوں نے یہ سوچا کہ وہ بھی اپنے مرشد اپنے محبوب کو اسی طرح تحفہ پیش کرینگے اور انہوں نے بسنتی لباس پہنا اور چند

مریدوں کو ساتھ لیکر حضرت کی خانقاہ پر بسنت کے گیت گاتے ہوئے پہونچے اور حضرت نظام الدین اولیاء کا طواف کرنے لگے۔ اور اپنے مرشد کے قدموں پر سرسوں کے پھول نچاور کرنے لگے۔ حضرت نظام الدین اولیاء انکی اس حرکت کو دیکھکر مسکرا اٹھے۔ یہ تہوار آج تک امیر خسرو کی یاد میں منایا جاتا ہے یہ تہوار ہندو مسلم یکجہتی کا ایک بہترین نمونہ ہے جسے ہندو مسلمان ملکر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر ہر سال مناتے ہیں۔ آج بھی اسی طرح بسنتی کپڑے پہنے سرسوں کا پھول ہاتھوں میں لئے بسنت کے گیت گاتے کثیر تعداد میں ہندو حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر آتے ہیں اور بسنتی پھولوں کا نزرانہ پیش کرتے ہیں۔

امیر خسرو کے صرف دو سخنے، پہلیاں، کہہ مکرنیاں اور انمیلیاں ہی نہیں بلکہ انکے فارسی کلام میں بھی سماج رواداری کی جلوہ گری نمایاں ہے۔ انکے اشعار سماجی رواداری کی بہترین مثال ہیں۔

سیر اولیاء کے مطابق حضرت امیر خسرو نے ۱۷ شوال ۷۲۵ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۳۲۵ء کو وفات پائی اور اپنے پیر و مُرشد کے مزار مقدس کے قریب سپرد لحد ہوے۔ اور اسطرح ہندوستانی تہذیب وثقافت، ادب اور شاعری کی یہ شمع ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔

الغرض خسرو کو ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شاعر کا مقام حاصل ہے۔ آپ ادبی دنیا کے وہ درخشندہ ستارہ ہیں جنہوں نے ۷۶۵ سال قبل اس دنیا سے اپنا ناتہ جاڑا تھا وہ ناتہ اتنا مضبوط تھا کہ آج بھی قائم و دائم ہے۔ انکا صرف کلام ہی گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار نہیں ہے بلکہ انکے مزار مقدس پر بھی بلاتفریق مذہب وملّت لوگ حاضری کے لئے آتے ہیں اور فیضیاب ہوکر جاتے ہیں۔

کتابیات:

۱۔ سیر الاولیاء، امیر خورد، دہلی ۱۳۰۲ھ
۲۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، حصہ دوم، شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ
۳۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، حصہ سوئم، شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ۔
۴۔ صوفی امیر خسرو، سید صباح الدین عبدالرحمن، شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ۔
۵۔ امیر خسرو شخصیت افکار و خیالات و فکر و فن، شاہد مختار، نئی دہلی، ۲۰۰۹
۶۔ امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، دہلی، ۲۰۱۵
۷۔ نہ سپہر، امیر خسرو، اکسفورڈ یونیورسیٹی پرس
۸۔ جواہر خسروی، مولانا محمد امین چڑیا کوٹی اور مولانا رشید احمد سالم مرتبین، علی گڑھ۔ ۱۹۱۰
۹۔ اعجاز خسروی، نول کشور ۱۸۷۶
۱۰۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی، کلکتہ، ۱۸۶۲
۱۱۔ سفینۃ الاولیا، داراشکوہ، آگرہ ۱۸۵۳۔
۱۲۔ دیباچہ غراۃ الکمال، کتب خانہ نظامیہ، دہلی

ساحرؔ لدھیانوی: اپنے افکار کے دریچے سے

ڈاکٹر شبانہ نسرین
ایسوسی ایٹ پروفیسر
صدر شعبہ اردو، لیڈی برابورن کالج، کولکاتا

Abstract:

Sahir Ludhianvi is considered one of the important progressive poets. He was among those few exceptional poets who, while being part of the film industry, also maintained their literary dignity. He gained as much fame in the film industry as he did in the literary world and was respected in both circles throughout his life. In Sahir's poetry, along with contemporary awareness and sensitivity, there are also signs of familiarity with the emotions of life. He wrote poetry that touches feelings and emotions. Sahir expressed the effects of the changing times and contemporary sensitivity with insight and artistic subtlety. In his work, the harmony of thought and art, and the freshness of emotion, enhance the beauty of his poetry. Whether it is the theme of revolution, religion and community, or separation and union, Sahir addressed all these subjects with great skill. Sahir is a poet of aspirations, emotions, exploration, and new ideas. In all his poetry, whether it was for films or otherwise, he expressed the unevenness of circumstances, the imbalance of issues, and the social, political, and economic disparities in a beautiful yet protest-driven manner. He made his songs a medium of this protest, raising the banner of humanism and humanity throughout his life.

ساحرؔ کی شاعری روحِ عصر اور آفاقی صداقتوں کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاص مندی اور سوز و گداز کے چراغ جلتے ہیں۔ انہوں نے انسانی نسل کی عظمت، انسانی زندگی کی جدوجہد اور سعی و پیکار کے تقدس کے آستانوں پر عقیدت کے سجدے نذر کئے ہیں۔ اپنے بارے میں ساحرؔ کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے
مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے

ساحرؔ کی شاعری شعورِ ذات کے انکشاف کا نام ہے۔ ایک شور ہے، موج ہے، دل ہے، عشق ہے، صرصرِ حیات ہے، فکر کائنات ہے، آئینہ احساسات ہے، رنگ و نور کا سیلاب ہے۔ ان کے اسی تخلیقی شعور سے انہیں پائندگی اور دوام عطا کیا ہے۔ روح کو مخمور کر دینے والی شاعری، قلب کو مسحور کر دینے والی گرمیٔ احساسات، رومانیت، بغاوت، اشتراکیت، اجتماعیت، سرمایہ و محنت، جذباتیت، ضبط و حوصلہ، فکر و اداسی، سرشاری و نغمگی یہ تمام ساحرؔ کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیں جو اس حقیقت کے غماز ہیں:

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاط روح کا ساماں نہ کر سکے
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون وخواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کارفرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی

یہ اداسی و مایوسی اور یہ وحشت ساحرؔ کے یہاں کہاں سے آئی تھی جس نے ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں ایک سوز و گداز، دردمندی اور گداختگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کیا وجہ تھی کہ ان کے نغمۂ طرب میں بھی کرب کے شعلے لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا سراغ ہمیں ان کی ذاتی زندگی اور ان کے عہد کے پس منظر میں لگانا ہوگا۔ ساحرؔ کی پیدائش 8/مارچ 1921ء میں لدھیانہ کے ایک معمولی اور جاگیردار خاندان میں ہوئی تھی۔ والد چودھری فضل محمد ایک بہت بڑے جاگیردار تھے جبکہ ان کی والدہ کا خاندان سماجی اور معاشی اعتبار سے ادنیٰ حیثیت کا حامل تھا۔ والد فضل محمد اس شادی کو بے جوڑ خیال کر کے اسے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور اپنے رشتۂ ازدواج کو سرعام لانے میں قباحت محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ والد اور والدہ کے درمیان آہستہ آہستہ تعلقات کشیدہ ہونے لگے اور انجام کار یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے منقطع ہو گیا۔ ساحرؔ کی والدہ فضل محمد کی گیارہویں بیوی تھیں اور ساحر اکلوتی اولاد نرینہ تھے۔ والد سے قطع تعلق کے بعد ساحرؔ نے ممتا کی چھاؤں میں پناہ لینے میں عافیت سمجھی لیکن باپ کی محبت و شفقت سے محروم

ہو گئے۔ایسی بات نہیں تھی پدرانہ محبت نے جوش نہیں مارا تھا لیکن ساحرؔ اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔بچپن کی یہ محرومی اور نا آسودگی کی ساری زندگی پر اثر انداز رہی۔اس محرومیٔ حیات نے ان میں ایک مستقل سوز و دردمندی کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس نے ان کی شاعری کو بھی بے حد حساس اور پروقار بنا دیا تھا:

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

ساحرؔ کی پیدائش کا زمانہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہے۔اس کے بعد عہد شباب آیا جو دوسری جنگ عظیم اور پھر اس کے بعد 1947ء کا انقلاب آفریں عہد تھا جس کے دوش پر آرزوؤں اور امنگوں کے چراغ جل رہے تھے۔ساحرؔ بھی آزادی کے اس مبارک عہد کے استقبال میں پیش پیش تھے۔تقسیم ہند کے بعد ساحرؔ نے پاکستان کو خیر باد کہا اور بمبئی قسمت آزمانے کے لئے چلے آئے۔بمبئی فلم انڈسٹری سے وابستہ کو ان کے گیت، غزلیں اور نظمیں جس طرح مقبول ہوئیں اس کا اندازہ شاید ساحر کو بھی نہیں تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ 1930ء سے لے کر 1950ء تک کا عہد ہندوستان کا زبردست انقلابی اور ہنگامہ خیز دور رہا ہے۔زندگی کی قدریں بدل رہی تھیں، بدیسی سامراج کے تابوت پر آخری کیل ٹھوکی جا رہی تھی۔آرزوؤں کے چراغوں کی اولین روشنی میں انسانی آزادی اور معاشی خوشحالی کی ایک نئی مشعل فروزاں کی جا رہی تھی۔ساحرؔ دیکھ رہے تھے کہ

ان کے ہم وطنوں اور شہیدوں کے خون سے نگارِ آزادی کے ماتھے پر سرخی بھری جارہی تھی۔ساحرؔ نے ان ہنگاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر ان انسانیت سوز ڈراموں کا کلائمکس بھی دیکھا۔جب قوم پرستوں نے قوم دشمنی کا بیوپار شروع کر دیا تھا وہ دھندا جو کل تک سامراجیوں کے ہاتھوں میں تھا وہ ساحرؔ کے ہم وطنوں کے ہاتھ آ گیا۔مفاد پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے رجحانات نے انسانیت کے شیرازے بکھیر دیئے۔قومیت اور طبقاتیت نے آدمیت کو نگل لیا۔آدمی آدمی سے ٹکرا گیا۔تہذیب تمدن کے پردے میں انتہائی درجے کی وحشت و بربریت کا دور دورہ ہوا۔اس صورتحال میں انسانی بقاوتحفظ کا خطرہ لاحق ہوگیا۔اس کے سدباب کیلئے ساری دنیا میں ایک عالمی تحریک شروع ہوئی۔ جس کا اولین مقصد امن وامان کی بحالی تھا اور ظلم وناانصافی کے خلاف عالمگیر سطح پر تمام انسانوں کو مورچہ سنبھالنا تھا۔دنیا کے دیگر ممالک کے لیڈران اور سرابراہوں کی سرپرستی میں ادباوشعرانے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ امن ومحبت کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی۔اس کے لئے باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔اردو شعرا وادبا بھی اس سے دور نہیں رہ سکے۔ان انقلابی شاعروں میں فیضؔ، جوشؔ،مجازؔ،اختر الایمان، جان نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروحؔ سلطان پوری کے درمیان ساحرؔ کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے طلوع اشتراکیت،شعاع فردا،جاگیر،اسی دوراہے پر، فنکار،فرار، مجھے سوچنے دے،گریز،میرے گیت وغیرہ وغیرہ لکھ کر ترقی پسند تحریک سے اپنی پوری وابستگی کا ثبوت پیش کر دیا۔ترقی پسند تحریک کی بنیاد کا اہم مقصد یہی تھا کہ مکتبہ فکر،خیال، ہیئت اور اصول کے بدلتے ہوئے سانچے میں غم جاناں کی خلش اور غم دوراں کی ہمہ گیری کی شمولیت لازمی ہو۔اردو شاعری میں یہ آواز 36ء سے گونجنے لگی۔جب اس خطۂ ارض میں بسنے والے کروڑوں انسان آزادی اور حریت کیلئے کمربستہ ہوگئے۔تاریخ عصر کے اوراق اس تخلیقی شرر سے تھرا اٹھے۔یہی وہ وقت تھا جب دوسری جنگ عظیم کے فتنے جاگ رہے

تھے۔معاشی نظام،غلامی، جہالت اور سامراجیت کی ماری ہوئی دنیا بیدار ہورہی تھی۔ویسے یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ شیریں رومانیت اور رسمی انقلاب کا ہنگامہ اس دور کے زیادہ تر شعرا کے یہاں ملے گا۔لیکن کچھ ایسے فنکار ضرور تھے جن کی شعری اور ادبی کاوشوں کا نیا محل قدیم خیالات کے توانا اور صحت مند عناصر کی بنیاد پر قائم ہورہا تھا۔ساتھ ہی ان کے یہاں تفکر، احساس اور خلوص کی پرکاری کے ساتھ ساتھ فنکارانہ صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔اس روشنی میں ہمیں چند ہی ایسے شعرا ملتے ہیں۔ان میں سے ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے فیض احمد فیضؔ کی اولیت پر مہر لگا چکا تھا۔فیضؔ اردو شاعری میں نئے رموز وعلائم، حسن تراکیب اور استعارہ سازی کے عمل کے ساتھ کلاسیکی لب ولہجہ کو بھی پروان چڑھا رہے تھے۔ان کے یہاں دل سوزی اور رومانی سوگواری اس عوامی جذبے کی پیداوار تھی جس کی فضاؤں میں نامرادوں اور بے کسوں کی بھوکی روحیں تیر رہی تھیں۔ساحرؔ جو نہ صرف فیضؔ کا ہم عصر شاعر تھا اس کا ہم نفس اور ہم نوا بھی تھا۔عوامی احساسات سے ساحرؔ کا سینہ لبریز تھا۔جمہوریت اور اشتراکیت کا پجاری تھا۔طبقاتی تقسیم کی ناہمواریاں ان کے شعور میں شور مچاتی رہیں۔لیکن ساحرؔ کے یہاں ایک چیز خصوصیت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ جب بھی انہوں نے انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے، جب بھی اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں سرفروشی کے خوابیدہ جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی اس میں چیخ وپکار سنائی نہیں دی۔ان کے یہاں نہ کوئی رسمی جوش وخروش نہ نعرہ بازی بلکہ مدھم آنچ سے کشید ہونے والا وہ تیز سیال مادہ جس کی قہر سامانی اور زہرناکی دھیرے دھیرے سرایت ضرور کرتی ہے مگر اس کے اثرات بہت دیر تک قائم رہتے ہیں۔یہ متانت اور سنجیدگی بہت کم ترقی پسند شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ساحرؔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ہمیشہ مخالف رہے۔ جہاں جہاں انسانیت مجروح ہوتی دکھائی دیتی ہے ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور صفحہ قرطاس پر ایسے لازوال اشعار رقم کرجاتے ہیں جس میں رجائیت اور نشاطیہ لب ولہجہ بھی بھرپور نظر آتا

ہے۔ کچھ اشعار دیکھیں:

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہوجائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

ساحرؔ نے ایک مفکر کی طرح تمام حالات کا جائزہ لیا تھا۔ ایک نقاد کی طرح اس پر تنقید کی تھی اور ایک مصلح کی طرح سماج کی اصلاح کیلئے اپنے اشعار سے کام لیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب ہندو پاک فسادات کی آگ نے ذرے ذرے کو جھلسا دیا تھا ساحرؔ بھی ایک حساس انسان کی طرح اس سے متاثر ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو شاعری کی وہ شاعری نہیں انسانیت کی مرثیہ سرائی ہے۔ ساحرؔ کے نزدیک فساد اور جنگ ہمیشہ آگ وخون سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ کسی ایک انسان کا خون نہیں تمام امن عالم کا خون ہے۔ انسانی بقاوتحفظ امن وانسانیت میں پوشیدہ ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں ساحرؔ کا قلم امن وانسانیت سے سرشار نظر آتا ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر

جنگ مشرق ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ مسئلوں کا حل کیا دے گی؟
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتجاج کل دے گی

اور پھر ساحرؔ تمام عالم انسانیت کو امن اور سلامتی کا پیغام دیتے ہیں اور جنگ کی تیرہ و تاریکیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جس سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں
جنگ، وحشت سے بربریت سے
امن، تہذیب و ارتقا کے لئے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لئے
جنگ، افلاس اور غلامی سے
امن، بہتر نظام کی خاطر

جنگ، بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن، بے بس عوام کی خاطر
جنگ، سرمائے کے تسلط سے
امن، جمہور کی خوشی کے لئے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن، پرامن زندگی کے لئے

ساحرؔ نے مذکورہ نظم ''خون اپنا ہو یا پرایا ہو'' میں جس پیرائے بیان میں امن وجنگ کی حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس تعلق سے ان کی دوسری نظمیں بھی قابل ذکر ہیں جیسے میرے گیت، مجھے سونے دے، صبح نوروز، طرحِ نو، طلوع اشتراکیت، بنگال، خودکشی سے پہلے، یہ کس کا لہو ہے، جاگیر، فنکار، میرے گیت تمہارے ہیں، لہو نذر دے رہی ہے حیات وغیرہ وغیرہ یہ وہ نظمیں ہیں جن میں ساحرؔ نے ارتقائے انسانی، بقائے جمہوریت، انقلاب وبغاوت، جبر وتشدد اور نظام آتش وآہن کی باتیں کی ہیں۔ ان نظموں میں دھنک رنگ نہیں آتشیں بگولے ہیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے:

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں، آتشیں بگولے ہیں!
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں

نظم ''تاج محل'' ساحرؔ کی بڑے ہی تلخ اور تیکھے لب ولہجہ والی نظم ہے جس میں تاج کی عظمت، اس کے جذبۂ تعمیر اور ایک شہنشاہ کی الفت ومحبت کے حریری اور دودھیا پیکر پر

بڑے جارحانہ انداز میں طنز و نشتر کے تیر چلائے ہیں۔ تاج محل کی خوبصورت عمارت، اس کی منقش در و دیوار، اس کے محراب اور طاق، مقابر اور فصیلوں میں ساحرؔ کو ایک مطلق العنان حکمراں کی عظمت و قوت اور رعونت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ محبت کا جذبہ بڑا ہی عظیم اور روحانی جذبہ ہے۔ دولت کے بل بوتے پر اس کی تشہیر کا سامان ساحرؔ کے خیال میں تمام محبت کرنے والوں کے لئے ایک ناسور اور ساتھ ہی احساسِ کم مائیگی کی وجہ بھی بن جاتا ہے۔ اسی لئے جب ساحرؔ اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ:

تاج تیرے لئے ایک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بلاشبہ ساحرؔ کی یہ نظم امارت و غربت کے درمیان صدیوں کی تفریق کی گواہی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر فکر تونسوی نے ساحرؔ کو بڑی خوبصورت بات کہی تھی کہ ''تم نے تاج محل'' لکھی اور اپنی نظم کو اصل ''تاج محل'' سے زیادہ شہرت بخشی۔''..... بلاشبہ اس جملے میں مبالغہ آرائی ہے لیکن اس مبالغہ میں بلاغت ضرور ہے۔

ساحرؔ فطری طور پر جمہوریت اور اشتراکیت کا پجاری رہا ہے جو ہمیشہ انقلاب و بغاوت کے نغمے گاتا رہا۔ کیا واقعی اس نے رومانیت کے چمن زاروں میں سیر نہیں کی تھی، کیا جنونِ عشق کے نغمے اس نے نہیں چھیڑے تھے، حیات ساحرؔ کا مطالعہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ساحرؔ نے بھی کسی کی خاطر محبت کے ایوان سجا رکھے تھے اور نہ جانے کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے اپنے خوابوں میں بسائے تھے۔ انہوں نے بھی کسی محبوب کے گیسو و عارض، اس کے پیراہن رنگیں اور ریشمی آنچل کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ فیضؔ کی طرح جس نے اپنے محبوب سے یہ کہتے ہوئے محبت سے یوں معذرت کر لی

تھی کہ

اب بھی دلکش ہے تیرا حسن ہے مگر کیا کہیئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلے سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ساحرؔ بھی اسی طرح حالات کی ستم گری میں فیضؔ کی ہمنوائی کا ثبوت دیتے ہیں اور محفل رنگ ونور کو خیر باد کہہ کر زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ساحرؔ کے سوز ودرد کی شدت اور انسانیت کا احساس عروج پر نظر آتا ہے:

میرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو، امامت کے تکبر کو
تل دل تابِ نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب اور ترانے گا نہیں سکتا

اور اس کے بعد انہوں نے عہد کرلیا کہ:

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم لچکیلی تانوں میں جوت دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھر پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلتے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانوں میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے سو بھاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

''تلخیاں، آؤ کہ کوئی خواب بنے'' ساحرؔ کے وہ شعری مجموعے ہیں جن کی غزلوں اور نظموں میں ساحرؔ کا غم ہے، ان کا اپنا تجزیہ ہے، محبت اور اس سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیتیں ان کی شاعری میں یوں جھلکتی ہیں کہ ان کا غم سب کا غم بن جاتا ہے اور یہی احساس ان کی شاعری کو جاندار بنا دیتا ہے۔

ساحرؔ نے عشق بھی کیا تھا اور اس کے زخم بھی کھائے تھے۔ ان کے دل کے تاروں کو یکے بعد دیگرے کئی حسیناؤں نے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ممکن تھا کہ زندگی رشک گلزار ہو جاتی لیکن نشاط اور شادمانی قسمت میں کم کم تھی وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں:

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

خوشی اور اداسی اسی طرح ہم سفر رہی۔ عشق کے راستے میں کبھی مذہب کی دیواریں حائل ہوئیں، کبھی سماجی حد بندیوں نے ساحرؔ کے عشق کو پنپنے نہیں دیا۔ اور یہ عشق اپنی جنون خیز کیفیتوں کے باوجود زخم خوردہ ہی رہا۔ اور ساحرؔ کی صبح و شام کا کیف زندگی کی مصلحتوں کے انبار میں دب کر رہ گیا۔

ایک یخ بستہ اداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری در ماندہ جوانی کی امنگوں کا سروش

لیکن اس کے باوجود وہ اپنے غموں کو نظر انداز کر کے محبوب کی پریشانیوں اور غموں کا بھی مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں پر ایک ایک لفظ ساحرؔ کی اپنی افسردگی اور شکستگی کا آئینہ بن جاتا ہے۔

میری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غم حیات غم یک نفس سے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے طولِ ہوس ہے، کچھ بھی نہیں

ساحرؔ کے یہاں شدت احساس ہے۔ تخیلی ماورائیت کی جگہ ارضیت ہے زندگی اور حسن کی حقیقی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اور جمالیات کی ایک ایسی کہکشاں بنائی ہیں جس کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں۔ کچھ اشعار دیکھیں:

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
میرے تخیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے
تیرے پیراہن رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے

رات کی سرد خموشی میں ہر ایک جھونکے سے
تیرے انفاس ، تیرے جسم کی آنچ آتی ہے

تیری آواز، انتظار، مضمحل خواب، خوبصورت موڑ، ہراس، فنکار، فرار، ناکامی، ایک تصویر رنگ، میں نہیں تو کیا، ساحرؔ کی یہ وہ نظمیں ہیں جو اردو ادب کی خوبصورت نظموں کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان نظموں میں اتنی انوکھی، خوبصورت اور جاندار تشبیہیں اور ایسے ایسے حسین مصرعے رومانی کیفیتوں کے اظہار کے لئے کہے گئے ہیں جو ایک جمالیاتی فضا اور خوابناک ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے یہ اشعار ؎

شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ ادائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگے ویرانے میں
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

مذکورہ اشعار ساحرؔ کی مشہور نظم ''تیری آواز'' سے لئے گئے ہیں۔ پوری نظم رومانیت اور جمالیت کی ایک خوبصورت تصویر ہے جس میں سوز و ساز کے ساتھ ایسی امیجری پیدا ہوتی ہے جو تصورات کی خوبصورت فضاؤں میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے۔

ساحرؔ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ زندگی سے اسی قربت نے ان کے شعر و فن کو جلا بخشی تھی۔ شعر و ادب کی دنیا میں ان کی حیثیت مستحکم ہے۔ ویسے تنقیدی زاویہ نگاہ سے یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہیں ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بلاشبہ فلموں نے انہیں جو شہرت و مقبولیت بخشی اور جس طرح سے ان کی زندگی

ہی نہیں عوام وخواص میں ان کے گیتوں اور نغموں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بمبئی آ کر فلموں سے وابستگی ہوتے ہی کامیابی ان کے قدم چومنے لگی۔ رومانیت ان کی فطرت میں رچی بسی تھی۔ ان کی رومانی گیتوں اور ساحرانہ انداز شاعری نے شائقین فلم کو دیوانہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری ساحرؔ کی گیت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس دور میں جان نثار اختر، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی جیسے ہر دلعزیز فنکار و گیت کار موجود تھے جن کے نغمے اور رسیلے بول عالمی سطح پر فلموں کو شہرت و مقبولیت کے ساتھ اس کے ادبی وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔ ان ہی مشہور و مقبول گیت کاروں کے درمیان ساحرؔ کی شخصیت اور شاعری ایک نئے حسن وادا سے دلوں کو مسحور کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات وحادثات کو اپنے گیتوں میں یوں ڈھال دیا کہ دنیا ان کی دیوانی ہوگئی۔ ملاحظہ ہو ان کی بے حد مشہور غزل کے چند اشعار:

نغمہ و شعر کی سوغات کسے پیش کروں
یہ چھلکتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں
کوئی ہمراز تو پاؤں کوئی ہمدم تو ملے
دل کی دھڑکن کے اشارات کسے پیش کروں

''کبھی کبھی'' ساحرؔ کی بے انتہا خوبصورت نظم ہے جس میں ساحرؔ اپنی زیست کی تیرگی کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ محرومیاں شادابیوں اور رعنائیوں میں بھی بدل سکتی تھیں لیکن شاید زمانے کو یہ منظور نہ تھا۔ اپنی بے شمار امنگوں اور تمناؤں کو سرسبز دیکھنے کی خواہش ان میں بھی جوان تھی لیکن حالات سازگار نہ تھے اور اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی غم باقی ہے نہ کوئی جستجو حتیٰ کہ اداسی کے یہ قافلے ان کی زندگی میں جیسے ٹھہر سے گئے ہوں:

نہ کوئی جادۂ منزل نہ روشنی کا چراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
ان ہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

اس نظم میں ساحرؔ نے اپنی پرسوز کیفیت کو جس رعنائی فکر اور شگفتگیٔ اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے اس نے ان کی نظم کو ہمہ گیر شہرت و مقبولیت بخشی ہے۔

ساحرؔ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں 1971ء میں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کی نظموں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ ان کی آفاقیت اور مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ساحرؔ جس نے کہا تھا کہ ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے نغموں کی بازگشت صدیوں تک سنائی دے گی۔

!!_____

مولانا جلال الدین محمد بلخی اور ان کا فلسفہ

ڈاکٹر محمد شاہد جمیل
اسسٹنٹ پروفیسر،
صدر شعبہ فارسی، گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کلکتہ

Abstract:

Maulana Jalaluddin Rumi (1207- 1272 AD.) was a Persian poet, mystic, and scholar whose profound spiritual legacy transcends cultures and centuries. Born in present-day Afghanistan, he later moved to Konya, Turkey, where he spent much of his life. Rumi is best known for his poetry, particularly the Masnavi, which explores divine love, the nature of the self, and humanity's relationship with God. His works, written in Persian, have been translated into many languages, making him one of the most widely-read poets globally.

Rumi's philosophy centers on the concept of tawhid (unity of God), emphasizing that all creation is interconnected and a reflection of the divine. He believed in the transformative power of love - both human and divine - as the path to enlightenment and union with God. His teachings stressed inner purification, the shedding of ego, and the pursuit of spiritual growth. The metaphor of the soul's longing to reunite with its divine source is a recurring theme in his works.

Rumi's spiritual practice was rooted in Sufism,and his followers, the Moulevi Order, are known for the practice of the whirling dervish dance, symbolizing the soul's journey toward spiritual awakening and unity with God. His message of love, unity, and inner reflection continues to inspire people today.

فارسی ادب کے عالمی شہرت یافتہ شاعر مولانا جلال الدین محمد بلخی جنہیں دنیا مولانا روم کے نام سے جانتی ہے وہ ایک غیر معمولی صوفی تھے اور سلسلہ مولوی درویشوں کے بانی تھے، جسے عام طور پر ترکی کے گھومتے درویشوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اپنے بانی مولانا جلال الدین کے نام پر ''جلالیہ سلسلہ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے[1]۔ تاہم، مولویہ سلسلہ کے قیام کا کریڈٹ ان کے والد سلطان العلما بہاؤالدین وَلَد کو جاتا ہے، جو اپنے دور کے ایک ممتاز عالم اور روشن خیال انسان تھے[2]۔ ان کے تین بچے تھے، ایک بیٹی اور دو بیٹے، اور ان میں مولانا رومی سب سے چھوٹے تھے۔ اس طریقے کی خاص خصوصیت ایک مخصوص قسم کا گھومنے والا رقص اور سماع تھا۔

مولانا جلال الدین ۶۰۴ ہجری مطابق ۱۲۰۷ عیسوی میں افغانستان کے شہر بلخ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ''مناقب العارفین'' کے مصنف نے ذکر کیا ہے، اور ۶۷۲ ہجری مطابق ۱۲۷۲ عیسوی میں ۶۸ سال کی عمر میں مرکزی شہر قونیہ (ترکی) میں وفات پائی[3]۔

مولانا جلال الدین کو ان کے قلمی نام ''رومی'' سے جانا جاتا ہے[4]، کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ قونیہ میں گزارا، جو ان دنوں ''روم'' کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بلخ کے ایک محترم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو نہ صرف مذہبی حلقوں میں بلکہ ریاستی انتظامیہ میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے والد کی جانب سے ان کی نسل حضرت ابوبکرؓ تک پہنچتی ہے، جو اسلام کے چار خلفاء میں پہلے تھے؛ اور والدہ کی طرف سے وہ شاہ خوارزم

کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مولانا وَلَد ایک ممتاز عالم دین تھے۔ ان کے علم اور زہد وتقویٰ کی بناء پر بلخ کے اشرافیہ نے انہیں ''شمس العلماء'' کے خطاب سے نوازا اور انہیں اپنے بااثر بیٹے مولانا رومی کی نسبت ''مولانا بزرگ'' بھی کہا جاتا تھا۔ مولانا وَلَد کی تقریر اور تبلیغ کا موضوع قرآن مجید کی تعلیمات پر مشتمل تھا، فلسفیوں اور عقلیت پسندوں کی تشریحات کو نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کو ناراض کیا۔ نتیجتاً، مولانا ولد کو ۱۲۱۸ عیسوی میں اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ شہر چھوڑنا پڑا، جن میں گیارہ سالہ جلال الدین بھی شامل تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق، مولانا ولد نے منگول خطرے کی وجہ سے اپنا گھر چھوڑا، جو ایشیاء کے اس حصے کو دھمکی دے رہا تھا[5]۔ مولانا ولد بغداد گئے اور مقدس شہر مکہ کی زیارت کی، جہاں انہوں نے حج کیا۔ یہ بات ریکارڈ کی گئی ہے کہ مکہ میں مولانا ولد کے خاندان کی ملاقات اسلامی صوفی بزرگ شیخ فریدالدین عطار سے ہوئی، جنہوں نے جوان جلال الدین کو روشن مستقبل اور علم کی شان کے لئے دعائیں دیں۔ مزید انہوں نے اپنی صوفیانہ کتابیں ''الٰھی نامہ'' ''اسرار نامہ'' مولانا کو عطا کی۔ یہ دونوں صوفیانہ کتابیں جلال الدین کے مطالعے میں رہیں اور ان کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

تاہم، جلال الدین کی زندگی کا اہم موڑ شمس تبریز سے ملاقات تھی[6]، جو قونیہ کی گلیوں میں گھومتے درویش تھے۔ جلال الدین پہلی نظر میں ہی شمس تبریز کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کے دل و دماغ میں ایک نئی خوشی پیدا ہوئی۔ جلال الدین شمس تبریز کی صوفیانہ شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے جلد ہی انہیں اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔ شمس تبریز نے کئی مہینوں تک جلال الدین کو روحانی اسرار و رموز اور عظمت الٰہی کی تعلیم دی۔ دونوں ایک پراسرار طریقے سے ملتے رہے، جس سے جلال الدین کے شاگردوں

میں شبہات اور ان کے رشتہ داروں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ رومی اور شمس کے درمیان گہرے جذباتی تعلق زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہا، اور شمس تبریز بلخ سے کسی نامعلوم منزل کی طرف نکل گئے۔ مولانا کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ان کے بیٹے اور شاگرد شمس تبریز کو واپس لائے، لیکن مختصر قیام کے بعد وہ ایک بار پھر مولانا کو چھوڑ کر چلے گئے اور کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ شمس تبریز کی جدائی نے جلال الدین رومی کے جذبات کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اپنے ممتاز شاگرد حسام الدین چلپی کے کہنے پر شاعری کا سہارا لیا[7]۔

جلال الدین کی شمس تبریز کے ساتھ والہانہ محبت اور جذباتی لگاؤ کے واقعات کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے استاد اور روحانی رہنما شمس تبریز کے لیے اپنے دل میں بے پناہ عزت و احترام رکھتے تھے۔ مولانا رومی نے اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام ''دیوانِ شمس تبریز'' رکھا، جو شمس تبریز کے ساتھ ان کی گہری محبت اور وابستگی کا مظہر ہے۔

''مثنوی روم'' مولانا جلال الدین رومی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اسے باطنی حقیقت کا ایک منفرد انکشاف قرار دیا گیا ہے اور بہت پہلے ہی جب عبدالرحمٰن جامیؔ نے اسے فارسی میں قرآن کہہ کر اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے:

مثنوی معنوی مولوی هست قران در زبان پهلوی

رومی بذات خود اپنی مثنوی کی اہمیت اور عظمت و برتری سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کتاب کے جلد چہارم کے مقدمہ میں 'اسے سب سے بڑا تحفہ اور قیمتی انعام' قرار دیا۔ مزید یہ کہ انہوں نے اسے اپنے دوستوں کے لیے روشنی اور آنے والے نسلوں کے لیے روحانی خزانہ کہا۔ درحقیقت، ۷۵۰ سال گزرنے کے باوجود، آج بھی دنیا بھر میں انسانی تہذیب کے سب سے قیمتی خزانے کے طور پر سجا ہوا ہے۔

جلال الدین رومی نے اپنی گفتگو کے موضوع کو کہانیوں کے فریم ورک میں ترتیب دیا ہے، جو اکثر ان کے باطنی معنی کی وضاحتوں کے ساتھ آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ آرائے نکلسن نے درست ہی کہا ہے:

> ''یہ کہانیاں زندہ دل مکالمے، ماہرانہ طنز اور انسانی فطرت کی مزاحیہ وضاحتوں سے بھرپور ہیں، جو آدابِ زندگی کی ایک تصویر پیش کرتی ہیں اور نہ صرف وسطی دور کے صوفیانہ نظریات بلکہ مسلمانوں کے عمومی نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہیں''۔[8]

مولانا جلال الدین رومی پہلے ایک صوفی تھے اور بعد میں شاعر۔ انہوں نے صوفیانہ اصطلاحات کو صرف شاعرانہ زینت کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں اپنے الہامی خیالات اور روحانی تجربات کے پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا۔ اپنی شاعری کے ذریعے رومی نے ایک اخلاقی نظام کو اجاگر کیا، جس میں دل کی پاکیزگی، خیرات، خودنفی اور جذبات کو لگام دینے پر زور دیا گیا، جو ابدی خوشی حاصل کرنے کے لیے اہم شرائط تصوّر کیے جاتے ہیں۔

رومی نے پوری کائنات کو ایک خدا سے نکلتا ہوا سمجھا۔ ان کے خیال میں ہماری روح کچھ نہیں بلکہ روشنی کی ایک کرن ہے جو اپنے منبع سے جدا ہو کر اس ادنیٰ اور مادی دنیا میں آ گری ہے اور مسلسل اپنے منبع کی طرف واپس لوٹنے کی کوشش کر رہی ہے، کیونکہ اسے خداوند سے ملاقات کی شدید خواہش ہے۔ اس نقطے کو مزید واضح اور قابل فہم بنانے کے لیے انہوں نے بانسری کی مثال دی، جو بانسوں کے جھرمٹ سے جدا ہو گیا ہے، لیکن اس کا دل مسلسل اپنے چشمے کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش میں ہے۔ اپنے بے مثال انداز میں رومی جدائی کے درد کو یوں بیان کرتے ہیں:

بشنو از نی چون حکایت می کند از جداییها، شکایت می کند
کز نَیستان تا مرا ببریده اند از نفیرم، مرد و زن نالیده اند
سینه خواهم شرحه شرحه از فراق تا بگویم شرح دردِ اشتیاق
هر کسی کو دور ماند از اصل خویش باز جوید روزگارِ وصلِ خویش 9

رومی نے عشق کو خداوند سے وصل حاصل کرنے کا واحد وسیلہ سمجھا کیونکہ یہی عشق ہے جو انسان کو تمام قسم کے تکبر اور خود پسندی سے آزاد کرا سکتا ہے، تکبر خدا کو سمجھنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ عشق، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جدائی کی آگ بھڑکاتا ہے اور روح کے گرد موجود سیاہی کو جلاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خام را جز آتش هجر و فراق کی پزد کی وارهاند از فراق 10

رومی کے نزدیک عشق وہ اولین احساس ہے جس سے انسان کو نوازا گیا ہے۔ یہ انسانیت کو ابدی خوشی عطا کر سکتا ہے کیونکہ اسی میں تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے، خاص طور پر وہ تکبر اور خود پسندی جو انسانی عظمت کے بلند مقام، یعنی خداوند کے ساتھ ضم سے روکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

شاد باش ای عشق خوش سودای ما ای طبیب جملهٔ علت های ما
ای علاج نخوت و ناموس ما ای تو افلاطون و جالینوس ما 11

مولانا رومی عشق کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ روح کو 'ایک حقیقت' سمجھنے میں تمام رکاوٹوں کو عبور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان کے مطابق، عشق کا مذہب تمام دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔ خداوند 'صرف ایک حقیقت' ہے جس پر ایک حقیقی خدا کا عاشق یقین رکھتا ہے۔

خداوند کی حقیقی محبت حاصل کرنے کے لیے سخت مشقت کرنا ضروری ہے۔ اگر

کوئی چاہتا ہے کہ وہ ہر چیز میں الٰہی کو دیکھے تو اسے دنیاوی لذتوں اور عیش وعشرت کو ترک کرنا ہوگا۔ رومی نے اپنی مثنوی میں اس حقیقت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جہاں انہوں نے لیلیٰ کی مثال دی۔ جب کوئی اس کی خوبصورتی کو کمزور کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے:

از دگر خوبان تو افزون نیستی گفت خامش چون تو مجنون نیستی
هر که بیدارست اودر خواب تر هست بیداریش از خوابش بتر
چون بحق بیدار نبود جانِ ما هست بیداری چون در بندان ما[12]

رومی نے اپنے ایک شعر میں درست طور پر کہا ہے کہ جو شخص زیادہ باخبر ہوتا ہے، وہ زیادہ تناؤ میں ہوتا ہے۔

هر که او بیدار تر پُر درد تر هر که او آگاه تر رُخ زرد تر[13]

رومی کے مطابق 'فقیری' یا 'درویشی' کا مطلب غربت اور بدحالی نہیں ہے، بلکہ یہ تکبر اور خود پسندی سے مکمل آزادی کا تقاضا کرتی ہے۔ بلاشبہ، دولت، پیشہ، اور نسل اس عارضی زندگی کے لیے ضروری ہے، لیکن یہی رکاوٹوں کی تسکین ہے جو ہمیں اپنے مقصد تک پہنچاتی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن بی قماش و نی زر و فرزند و زن
مال را کز بهر دین باشی حمول نعم مال صالح خواندش رسول
آب در کشتی هلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است[14]

رومی انسانیت کے اتحاد کی وکالت کرتے ہیں۔ اگر دل پاک ہو تو ذات یا عقیدہ، قوم یا زبان کا فرق ہماری یکجہتی میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ وہ کہتے ہیں:

ای بسا هندو و ترک هم زبان ای بسا دو ترک چون یگانگان
پس زبان همدلی خود دیگر است همدلی از همزبانی بهتر است[15]

مولانا جلال الدین رومی نے بے شمار صوفیانہ خیالات اور تصورات کو پانچ اہم نکات کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ تخلیق، خوبصورتی، انصاف، محبت اور زندگی۔ لیکن خلاصہ کے طور پر ہم اسے درج ذیل الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔

اولاً، حقیقت ایک ہے اور تمام مظاہر اس کے مختلف پہلو ہیں۔ دوم، تمام مخلوقات حتمی حقیقت سے نکلتی ہیں، اس لیے وہ اپنے اصل ماخذ کی طرف واپس جانے کا رجحان رکھتی ہیں۔ سوم، حقیقت کو کسی حد تک عقل سے سمجھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ عقل جامع ہو۔ چہارم، حقیقی علم تجربے سے حاصل کیا جا سکتا ہے، منطق سے نہیں۔ پنجم، زندگی کا بنیادی مقصد روح کا اپنی حقیقت یعنی حقیقت الٰہی سے ملاپ ہے۔ ششم، عشق روحانی ادراک کے سوا کچھ نہیں اور علم الٰہی صرف عشق کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے جو انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ ہفتم، یہ عشق تمام مذاہب کا بنیادی سرچشمہ ہے اور بالآخر یہ ابدی خوشی کی طرف لے جاتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں محبت اور عالمی بھائی چارے کا جو صوفیانہ فلسفہ پیش کیا ہے، وہ جدید دور میں پوری عالم انسانیت کے لیے ایک مشعل راہ بن سکتا ہے اور دنیا کے مختلف اقوام کے درمیان باہمی افہام وتفہیم اور فلاح و بہبود کے دور کا آغاز کر سکتا ہے۔ مثنوی کے پیغامات کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچانا ضروری ہے تاکہ مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنے والی بے چین اور مضطرب انسانیت کو نجات حاصل ہو سکے۔

حوالہ جات:

1۔ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو)، دہم، جلد 7، 1971؛ پہلا ایڈیشن، صفحہ 325۔
2۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 10، 15 واں ایڈیشن، 1973-74، صفحہ 14۔

3۔ دائرہ معارف اسلامیہ، صفحہ 325۔
4۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد 10، 15 واں ایڈیشن، 1973-74، صفحہ 14۔
5۔ ایضاً۔
6۔ ایضاً۔
7۔ رضازادہ شفق، تاریخِ ادبیاتِ ایران (اردو)، دہلی، 1969، صفحات 359-361۔
8۔ آرائے نکلسن، Tales of Mystic meaning، صفحہ xxv۔
9۔ مثنویِ معنویِ جلال الدین مولوی، مدیر: توفیق ایچ۔ سبحانی؛ ایران 1373، صفحہ 3، اور رضازادہ شفق، صفحہ 365۔
10۔ ایضاً، صفحہ 125۔
11۔ ایضاً، صفحات 3-4۔
12۔ رضازادہ شفق، تاریخِ ادبیاتِ ایران (اردو)، دہلی، 1969، صفحہ 369۔
13۔ ایضاً، صفحہ 369۔
14۔ ایضاً، صفحہ 370۔
15۔ ایضاً، صفحہ 372۔

قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" میں اشترا کی لہر

ڈاکٹر شبنم پروین
اسسٹنٹ پروفیسر،
صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کلکتہ

Abstract:

Quratul-ain Hyder (20 January 1927-21 August 2007) was an Indian Urdu novelist, short story writer, an academician, and a Journalist. He is one of the most outstanding and influential literary names in Urdu literature. She is best known for her magnum opus, Aag Ka Darya (River of Fire), a novel first published in Urdu in 1959, from Lahore, Pakistan, that stretches from the fourth century BC to post-partition India. The novel timeliness spanned more than two thousand years, starting from the time of Chandragupta Maurya in the fourth century BC to the post-Independence period in India and Pakistan. Together the characters reflect the oneness of human nature amidst the nationalist and religious upheavals of Indian history. Hyder argues for a culture that is inclusive.

Hyder traces the fates of four souls through time: Gautam, Champa, Kamal, Cyril. Gautam (appearing first as a student of mysticism at the forest University of Shravasti in the fourth century B.C.E) and Champa (throughout embodying the enigmatic experience of Indian women) begin and end the novel.

قرۃ العین حیدر اردو کے چند چوٹی کے ناول نگاروں میں خاص عظمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ان کے ناولوں نے اردو ناول نگاری کو فکر وفن کی نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے۔ حیدر کے ناول فن ،تکنیک ، جزئیات اور منظر نگاری کے اعتبار سے قابلِ قدر درجہ رکھتے ہیں۔اسلوبِ نگارش نہ صرف دلکش اور جاذب توجّہ ہے بلکہ اس کی تہہ میں رومانیت کی جھلک بھی ملتی ہے اور انسانی نفسیات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کا ہنر قابل تعریف ہے۔ حقیقت اور جذبات کی آمیزش کا دلکش بیان ملتا ہے۔شعور کی رو کی تکنیک ان کے ناولوں کی خاص خصوصیت ہے، ان کا دائرہ کار نہایت وسیع اور پیشکش عمدہ ہے۔ان کے ناولوں میں "میرے بھی صنم خانے"(1947)،"سفینۂ غم دل"(1951)،"آگ کا دریا"(1959) ،"آخر شب کے ہم سفر"(1979)،"کارِ جہاں دراز ہے"،"گردش رنگ چمن"(1988)،" چاندنی بیگم"(1990)وغیرہ ہیں۔

درحقیقت قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں اکثر جگہوں پر اشتراکی نقطہ نظر کو بہت ہی خلاقی سے پیش کرتی ہیں۔انہیں مزدوروں کی زندگی سے ہمدری ہے اور دولت مند طبقے کی عیاشیوں سے شدید نفرت ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اور اسے خیال آتا ہے، ارے ہم تو آزادی کے دیوانے تھے، ہم چاہتے تھے کہ ہماری جنتا کے رہن سہن کے ڈھنگ کا معیار اونچا ہوجائے ۔ ہماری بڑی آرزو تھی کہ کوئی جاہل، بھوکا نہ رہے، اقتصادی اور طبقاتی کشمکش..... جنتا کے رہن سہن کا معیار اونچا ہوا۔کتب خانے رات کے اسکول''۔

("میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین حیدر-ص:436)

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں "آگ کا دریا" ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں فلسفیانہ انداز کی کارفرمائی ملتی ہے۔اس ناول کا کینوس اردو کے تمام ناولوں میں سب سے زیادہ وسیع ہے جو اپنے دامن میں ڈھائی ہزار سال کی تہذیبی

تاریخ کو سمیٹے ہوئے ہے جو ہر دور کی عوامی قوتوں، معاشرتی پہلوؤں، سیاسی پالیسیوں اور عام سماجی حقیقتوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ یہ تاریخ قدیم ہندوستانی تہذیب سے شروع ہوکر قیام پاکستان کے واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ سارے واقعات گوتم نیلمبر، ہری شنکر، کمال اور چمپا کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ کردار ہر دور میں اپنی جنس تبدیل کئے بغیر معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ اس میں ماضی اور حال کی سیاسی و معاشرتی تاریخ کا پھیلاؤ ناول کے دامن کو اس قدر وسیع کرتا ہے کہ اس کے بعد کے ناول نگاروں نے بھی تاریخ کے تذکرے کو اپنے ناول میں برقرار رکھا۔ بقول وحید اختر:

> ''آگ کا دریا'' ہماری تہذیب کی دستاویز بھی ہے اور ہم عصر طرز فکر و احساس کا آئینہ خانہ بھی۔ اگر اسے اردو کا سب سے بڑا ناول نہ مانا جائے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ناول اردو کے دو تین بڑے ناولوں میں سے ہے''۔

(قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ- ڈاکٹر ارتضی کریم صفحہ: 297، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2001- بار دوم)

گوتم اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ہندوستان کی تہذیبی روح کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اس کے کردار میں فلسفے کی آمیزش بھی بالکل ہندوستانی ذہن کے مطابق ہے۔ اس کا زمانہ بدھ کے سو سال بعد کا ہے۔ وہ سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور کرب اور دکھ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں اور تاریخ کے گزرتے وقت مختلف چہرے لئے ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ طالب علم، چتر کار، گائیک، ڈرامہ نگار، اداکار، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذمہ دار منتظم اور بیوروکریٹ، سفارت کار اور بہت کچھ ہے۔ گوتم اپنے دل میں عورت کے لئے بہت ہی نرم جذبہ رکھتا ہے اور اس کے دکھ سکھ کو گہرے طور پر محسوس کرتا ہے اس کے نزدیک عورت کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

ہری شنکر ایک باشعور انسان ہے اور گہری فکر سے مملو بھی جو بدھ کی ترجمانی کرتا ہے اس طبیع میں وہ بے چینی اور اضطرابی نہیں جو گوتم کے یہاں ملتی ہے۔ چمپا بائی کا کردار بھی بہت اہم ہے جو مردوں کی بتائی ہوئی دنیا میں، مردوں کے بنائے ہوئے قانون کے آگے سرنگوں ہے۔ یہ کردار کرب و اذیت میں بھی خود کو سنبھالے رکھتا ہے ۔ دوسرے اہم کرداروں میں عامر رضا، نرملا، کمال احمد، طلعت وغیرہ ہیں۔

ناول کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ وقت دراصل آگ کے دریا کی مانند ہے جس میں انسانی وجود بار بار ڈوبتا اور ابھرتا ہے۔ یہ ایک ایسی تند و تیز آندھی ہے جس نے انسانی وجود کا زبردست تھپیڑوں سے شکستہ و مجروح کر دیا ہے۔ وقت ہی دراصل ناول کا سب سے جاندار اور فعال کردار ہے جو تہذیبوں کے عروج و زوال، فلسفیوں کی موشگافیوں کی بے وقعتی ، اقدار و تصورات کی تعمیروں کی بے ثباتی، کرداروں کی انفرادی زندگیوں اور ان کے تجربات پر غالب ہے۔ یہی ان کی تشکیل بھی کرتا ہے اور خود میں انہیں جذب کر کے فنا بھی کر دیتا ہے ۔ یہ وقت کبھی نہیں بدلتا۔ انسان بدل جاتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ اسی طرح رواں تھا اور رواں رہتا ہے۔

ناول کا فکری پس منظر قدیم ہندوستانی تہذیب کے اولین دور سے شروع ہوتا ہے۔ ناول کی کہانی تین ادوار پر مشتمل ہے۔ ویدک عہد سے شروع ہو کر موریہ خاندان کے دور حکومت، مغلوں کا عہد، سامراجی دور اور آخر میں ملک کی تقسیم کے واقعات کے تاریخی پس منظر کو پیش کرتا ہے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقا کی کہانی شرواستی اور پاٹلی پتر کی تہذیب ، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب ، انگریزی سامراج کی چیرہ دستیاں اور پھر اس کا زوال، مختلف قومی تحریکیں، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد پھر تقسیم کا مسئلہ اور پھر ہندوستانی و پاکستانی معاشرتوں کا احاطہ بڑے کامیاب ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ گوتم اور ہری شنکر کے وسیلے سے بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں گوتم ، ہری شنکر، وید، گیتا،

مہابیر رام کرشن، تلسی داس، کبیر داس وغیرہ کے تذکروں کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی، جناح، جواہر لال نہرو بھی اس ناول میں موجود ہیں جن کی اعلیٰ انسانی خدمات اور رومانیت کے فلسفے کو سراہا گیا ہے۔ وہ اپنی روح کو بھی ہندوستان کی روح سے الگ نہیں سمجھتیں اس لئے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی ہی داستان سنا رہی ہیں۔

جہاں تک اشتراکی انداز فکر کا تعلق ہے، مصنفہ براہ راست اشتراکی فلسفہ حیات سے انسلاک نہیں رکھتیں، لیکن ان کے ہاں اشتراکی اصطلاحات ضرور نظر آتی ہیں کیونکہ ان کا دل ہمدردی سے مملو ہے اور وہ انسان دوستی کے نظریئے کی قائل وہ امن کی پیغامبر ہیں۔ وہ ایک پرسکون فضا کی متلاشی ہیں تاکہ ہر انسان آزادی کے ساتھ سانس لے سکے اور استحصال کا خاتمہ ہو سکے۔ جب تک سماج طبقات میں بٹا ہوگا۔ سماجی کشمکش کا احساس بدستور جاری رہے گا۔ جبر و تشدد کا بازار گرم رہے گا اور انسانی استحصال کی فضا چھائی رہے گی۔ مصنفہ کے یہاں اشتراکی رجحان یا نچلے، مظلوم اور پسماندہ طبقہ سے ہمدردی کا جذبہ بھی کارفرما ملتا ہے جس کا اعتراف عبدالمغنی یوں کرتے ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے معاشرتی تجزیئے میں معاشی عنصر بھی مدنظر ہوتا ہے۔ ان کی ہمدردیاں پچھڑے ہوئے کمزور و لوگوں، تباہ حال کسانوں، مفلس، مزدوروں اور نادار انسانوں کے ساتھ ہیں حالانکہ خود ان کا تعلق خوشحال اعلیٰ متوسط طبقے سے ہے۔ اپنے اقتصادی، تجزیئے میں وہ خاص کر استحصال اور ٹھیکے داری کی مذمت کرتی ہیں۔ حقوق یافتہ عیاشوں کی قلعی کھولتی ہیں اور دولت مند ظالموں کو نشانہ تنقید بناتی ہیں''۔

(قرۃ العین حیدر کا فن- عبدالمغنی -صفحہ: 97-98، اکتوبر 1985 موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ زراعتی مسائل نے برطانوی سامراج کے عہد

میں مظلوم اور بدحال کسانوں کو جس طرح ہراساں کر رکھا تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لگان کی زیادتی نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور قحط سالی نے انہیں بھوکوں مرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مصنفہ نے اپنی اس تاریخی دستاویز میں جہاں مختلف واقعات اور پہلوؤں کی وضاحت کی ہے وہاں محنت کش طبقہ کے مسائل کی بھی عکاسی کی ہے:

''....زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا جہاں پیداوار کم تھی لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے''۔

(''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر، صفحہ 224، 1984، اردو کتاب گھر، دہلی)

سماج جو مختلف طبقوں میں منقسم ہے، وہاں نچلے اور بدحال طبقے کو کسی بھی طرح کی سہولت دستیاب نہیں۔ یہ مظلوم و نادار طبقہ ہمیشہ سے سرمایہ داروں اور طبقہ اعلیٰ کے جبر و ستم کا شکار رہا ہے۔ ان سے ہمدردی رکھنا تو دور، ان کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ مصنفہ نے بظاہر اپنے طبقے کی بلند پائیگی کا فخریہ ذکر کیا ہے، لیکن طنز کی کاٹ دردمندی کے احساس کو گہرا کر دیتی ہے:

''نچلے طبقے کے لوگوں نے مہینہ بھر ہی والی بال کھیلا ہوگا کہ کوٹھیوں کے رہنے والوں نے میدان کے مالک سے شکایت کی ان کی وجہ سے ماحول میں فرق آتا ہے۔ اسکے بعد سے والی بال کھیلنے والوں کا آنا بند ہو گیا اور میدان میں پھر سناٹا چھا گیا''۔ (ایضاً، صفحہ 319)

محنت کش طبقہ پر ہونے والے مظالم اور اس زمانہ کے سیاسی صورت حال کی عمدہ مرقع کشی بھی اس میں ملتی ہے اور ساتھ ہی سرمایہ اور محنت کی کشمکش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جس طرح برطانوی سامراج میں زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے محنت کش انسانوں، افلاس زدہ کسانوں اور گھریلو دستکاریوں کو تباہ کر رکھا تھا اس کا شعورانہ احساس رکھتے ہوئے مصنفہ

نے پورے عہد کو حقائق کی روشنی میں پیش کر دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو جو اشتراکی اور طبقاتی آویزش کی عکاسی کرتا ہے:

''قمرن اور قدیر دونوں کسانوں کی اولاد تھے۔ ڈرائیور بننے سے پہلے قدیر اپنے ضلع کی کسان سبھا میں شامل تھے اور چرخے کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موتی لال کا ولایت پلٹ بیٹا زمینداری کی بیخ کنی کرنے کے درپے تھا۔ گاؤں گاؤں گھومتا تھا۔ کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا تھا اور اودھ کے کسانوں کا لیڈر بنا ہوا تھا۔ تعلقہ داری سسٹم نے کسانوں کی جو درگت بنا رکھی تھی اس سے قدیر سے بہتر واقف کون ہوسکتا تھا۔ اسی لئے جب گلفشاں کے لان پر کمال کے دوست احباب سوشلزم پر کبھی لمبی چوڑی بحثیں کرتے تو قدیر بھی کسی نہ کسی بہانے سے جا کھڑے ہوتے اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ ان کے گاؤں کے زمیندار ٹھاکر صاحب کے سپاہیوں نے ایک روز جب لگان ادا نہ ہونے پر ان کے باپ کو ڈنڈوں سے اس قدر مارا کہ وہ ختم ہو گئے تو قدیر کو کلکتے جا کر کلینری کرنی پڑتی تھی اور ان کے گھر میں اب بھی روپوں کے لالے پڑتے تھے۔ ان دنوں ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کانگریس نے تحریک چلا رکھی تھی کہ حکومت کو ٹیکس مت ادا کرو، گاؤں گاؤں یہ تحریک چل رہی تھی۔ حکومت اور زمیندار ایک طرف تھے۔ کسان اور کانگریس دوسری طرف، قدیر کے گھر ایک زمانے میں قالین بھی بنے جاتے تھے مگر سرکاری پالیسی اور مشینی مال کی درآمد کی وجہ سے گھریلو صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ زمین پر بوجھ بڑھتا گیا تھا اور زمیندار کو لگان ادا کرنا برحق تھا۔ انہی حالات نے قدیر کے باپ کی جان لی مگر اب جو کچھ لکھنو شہر میں ہو رہا تھا وہ قدیر کی عقل میں نہیں آتا تھا۔ بے اطمینانی اور انتشار کی اصل وجہ اقتصادی تھی۔ زمیندار اور

کسان کا تصادم تھا۔ برطانوی حکومت اس بے اطمینانی کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہی تھی تا کہ عوام کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہو جائے''۔

(ایضاً، صفحہ:323-324)

ہندوستان کی اکثریت کسانوں پر قائم تھی۔ انگریزی عہد میں قابل رحم حالت سب سے زیادہ کسانوں کی تھی جنہیں استحصال کے دریا کی گہرائی میں کچھ اس طرح ڈبو دیا کہ ان کا ابھرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ طرح طرح کے جبر و استبداد سے انہیں بدحال اور قرض دار بنایا جا رہا تھا۔ ان کی زندگی کو ابتر اور بے بس بنا دیا گیا تھا:

''جاگیرداروں، مڈل کلاس لیڈروں ذہن رستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چائے کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتہ، احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔ کانگریس نے غصے سے زرعی اصلاحات کے لئے ایجی ٹیشن کر رکھا تھا۔ کسانوں کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے مختلف صوبوں میں مختلف حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی۔ بنگال میں جہاں انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی وہاں مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر کے ہندوؤں کو ان کی جگہ طاقتور بنایا تھا۔۔۔۔ یوپی جو ہندوستان کا دل تھا اور ملک کی ساری قرون اولیٰ قرون وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ وہیں کا کسان سب سے زیادہ مفلوک الحال تھا۔ کسان جو کانگریس تحریک کی طرف آ رہا تھا۔ سمجھتا تھا کہ سوراج کا مطلب زرعی اصلاحات ہے جب اسے جنم جنم کے ظلم اور قرضے کے بوجھ سے نجات ملے گی''۔

(ایضاً، صفحہ:۱۸۳)

نچلے اور پسماندہ طبقے کی ناداری کے ساتھ ساتھ انسان کی بنیادی ضرورت بھوک مادی حقیقت کے راز کو بھی مصنفہ نے افشا کیا ہے۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس کے آگے زندگی کا ہر فلسفہ ہر رشتہ، ہر خوشی ہیچ ہے، بھوک کے گرچہ مختلف اقسام ہیں لیکن پیٹ کی بھوک سے توانا کوئی بھی بھوک نہیں۔ اگر پیٹ کی آگ بجھی ہوگی تو انسان ہر خوشی خود بہ خود کسی نہ کسی ذرائع سے ڈھونڈ ہی لے گا:

"بھوک سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ عمر بھر اسے بھوک ستاتی ہے۔ محبت کی۔ روٹی کی۔ سکون کی .... مادہ پرست گلشن نے کہا "بھوک اور پیاس ہمارے سب سے بڑے بھوت ہیں میں سب سے پہلے ان بھوتوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ دوسری نجات مجھے آپ سے آپ مل جائے گی"۔ (ایضاً، صفحہ:662)

غرض اس ناول میں سرمایہ دارانہ جبر اور برطانوی آویزش کی پر درد مرقع کشی بھی ملتی ہے۔ گرچہ طبقہ اعلیٰ کی زندگی، ان کے رسم و رواج، اقدار و روایت، خیالات و میلانات پر ان کی بھرپور توجہ ملتی ہے لیکن "آگ کا دریا" ایک ایسا ناول ہے جو کسی خاص طبقے کی زندگی کی عکس ریزی تک محدود نہیں۔ جس طرح ہندوستان مختلف مذاہب اور سماج مختلف طبقات کی زندگی کا ترجمان ہے اس طرح یہ ناول دراصل ہندوستان کی مکمل تاریخ کی داستان ہے جس میں ہندوستانی مٹی کی خوشبو بسی ہے، ہندوستانی زندگی کی روح سمٹ گئی ہے جہاں ہندوستان کے دل کے دھڑکن سنائی دیتی ہے اور ہندوستانیوں کے احساسات کا پورا عکس نظر آتا ہے غرض کہ یہ ناول اپنے دامن میں ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی روداد کو سمیٹے ہوئے انسانی مساوات، بھائی چارگی، اخوت اور قومی یکجہتی کی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔

افسانہ ''بے حسی'' ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد محسن خان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کلکتہ

Abstract:

'Behisi "is a famous story of Dr Ishrat Betaab. Ishrat Betaab is a renowned short story writer of Urdu literature. He is also known as a critic and research scholar. His first story book 'Thandi Aanch ka Suraj" published in 1988. After that he wrote several story books entitled Rait per uga hua gulab (1988), Besamar e hayaat (1996), Barf mein Chingari (2002), zehn ke band darichon se (2010) and Safar jari hai (2015).

Ishrat Betaab describes women's miseries and problems in society specially poor women in his stories. His most writings encompass reality, romantic and many social facts.

In the story 'Behisi "he describes the social problems of third gender. Society has not accepted the existence of this gender, but this gender extremely loves his community. That is why when the story writer. wrote a story on his community, a group of this gender came to take this story proudly. Story writer was suddenly surprised after looking them in front of his door.

Where this story describes the problems of this class there we can see their love, respect and sympathy in favour of them.

ڈاکٹر عشرت بیتاب اردو افسانوی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ان کا پہلا افسانہ لاش پر محل ہے جو'' شکیلہ'' ممبئی میں 1968 میں شائع ہوا۔1968 میں ابھرنے والے افسانوی وادبی شوق کی تکمیل مختلف طریقے سے ہوتی رہی۔آج جب ہم ان کے ادبی سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے افسانے اور تحقیق میں اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔جہاں وہ ایک طرف اچھے افسانہ نگار ہیں وہیں دوسری طرف وہ اچھے محقق بھی ہیں۔اب تک ان کے چھ افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی آنچ کا سورج''(1988)،''ریت پر اگا ہوا گلاب''(1992)، بے ثمر حیات(1996)، برف پر چنگاری(2002)، ذہن کے بند دریچوں سے(2010)، اور سفر جاری ہے(2015)، میں شائع ہو چکے ہیں۔ٹھیک اسی طرح ان کی تحقیقی کتابیں'' مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر(1982)، ابتدا (1990)، بنگال کے افسانوں کا ساٹھ سالہ انتخاب(2008)، بنگال میں اردو افسانے کی پیش رفت(2011)، بنگال میں اردو افسانے 2000 کے بعد(2013) میں معرض وجود میں آئیں۔

عشرت بیتاب کی اصل شناخت افسانہ نگار کی ہے مگر بحیثیت محقق ان کی مذکورہ کتابیں بنگال کے افسانوی ارتقاء اور بدلتے ہوئے افسانوی میلانات اور رجانات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں۔عشرت بیتاب نے ان اصنافِ ادب میں اپنی تخلیقی جودت اور اختراعی قوت کے ساتھ ساتھ ادبی توازن بھی برقرار رکھا ہے۔تحقیق میں انھوں نے مغربی بنگال کے افسانوی ادب پر خاص توجہ دی ہے۔تحقیق صرف مواد جمع کر لینے اور اسے ترتیب

دے کر پیش کر دینے کا نام نہیں بلکہ اس عمل میں سائنٹفک طریقہء کار کا سہارا لے کر مواد کی حقیقت وصداقت کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔عشرت بیتاب نے اس عمل میں اپنی اجتہادی صلاحیت کا ثبوت اس انداز میں دیا ہے کہ ان کی تحقیقی کاوشیں زمانی ترتیب سے انجام پاتی ہیں۔

جہاں تک ان کے افسانے کی بات ہے تو یہاں بھی انھوں نے مشاہدہ ومطالعہ سے کام لیا ہے۔انھوں نے سماجی ومعاشرتی اعتبار سے جو کردار تراشے ہیں ان میں بڑی توانائی ہے۔ان کا کردار حقیقی اور زندہ کردار ہے۔افسانے کا قاری سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقے کے دکھ درد اوران کی اضطرابی کیفیت میں شریک ہوجاتا ہے۔کردار کا غم اس کو اپنا غم معلوم ہوتا ہے۔کردار کے انتخاب میں بھی انھوں نے صرف اور صرف اپنی ہمدردی اور انسان دوستی کا ثبوت اس انداز میں دیا کہ انھوں نے تیسری جنس (ہجڑا) کو بھی اپنے افسانے کی زینت بنایا ہے۔ان کے دلی جذبات،خواہشات اور اپنے ہم جنسوں سے محبت کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔افسانہ ''بے حسی'' میں ہجڑے کے اس جذبے کو دیکھا جا سکتا ہے۔

افسانہ ''بے حسی'' کی ابتدا سسپینس سے ہوتی ہے۔ڈھلتی ہوئی شام اور ریلوے کراسنگ کی خاموشی افسانے میں حیرت کا باعث بنتی ہے۔قاری کی حیرت میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب افسانہ نگار بھی صرف آواز سنتا ہے۔''میں تیری کہانیوں کی وجہ سے پاگل ہوا ہوں''۔افسانہ نگار افسانے کے بیشتر حصے میں سرگوشی کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔اس سرگوشی میں افسانہ نگار کی گرفت قاری پر بہت مضبوط ہے۔افسانے میں دلچسپی اس وقت اور بڑھتی ہے جب افسانہ نگار کو بغور دیکھنے پر متکلم کا صرف ایک ہیولا سا نظر آتا ہے جو گہرے رنگ کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہے:

''بے تاب میری اس آ شفتہ سری کی وجہ تیری الٹی سیدھی کہانیاں ہی ہیں۔ میں تیری بے تکی کہانیوں سے ہی اس حال تک پہنچا ہوں۔ تیری کہانیاں پڑھ کر میں حواس باختہ رہا کرتا تھا اور اب مجھے لوگ پاگل کہتے ہیں''

''تم آخر ہو کون؟''

''میں تمہارے افسانے کا ایک ادنیٰ سا قاری ہوں۔''

افسانہ نگار کی ہیجانی کیفیت بڑھتی گئی اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اس کا ذہن ''ہوائیں'' سیریل کی طرف منتقل ہو گیا کہ کہیں اس میں بھی کوئی بدروح تو نہیں سما گئی ہے۔ گھبراہٹ کے عالم میں ایسے حالات کا درآنا فطری امر ہے۔

افسانہ نگار نے اپنی اس کیفیت کو زائل کرنے کے لیے سورہ ''یٰسین'' پڑھ کر پانی پر دم کیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی انڈیل لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے افسانہ نگار پر غنودگی سی طاری ہوئی۔ پھر کیا تھا، پھر وہی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا:

''تم اپنے کردار کو نہیں پہچانتے۔ وہی جسے تم نے کہا تھا۔۔۔۔ یہ تو پگلا ہے''۔

افسانہ کے اس مقام پر دونوں کے مابین جو گفتگو ہوئی اس سے کردار اور افسانہ نگار کے اپنے خیالات پورے طور پر سامنے آتے ہیں۔

کردار نے جب کہا '' ہاں وہی کردار۔۔۔۔۔ جسے تم نے مسخ کر کے چھوڑ دیا تھا''۔ تو اس کے جواب میں افسانہ نگار نے اس کی تردید کی اور کہا کہ میں نے ایک سیکولر کردار بنا کر پیش کیا تھا، اس پر کردار کا جواب:

''یہی تو دکھ ہے کہ تم نے تو دھندو کی دہلیز کے پتے چٹخارنے اور
مسلمانوں کے دسترخوان کے ترنوالے کی لونڈیاں بنا کر رکھ دیا تھا مجھے''۔

یہ جملہ معنویت سے پر ہے۔آج مذہب کے نام پر ہر کوئی اپنی روٹی سینکتے ہوئے نظر آتا ہے۔مذہب کا لیبل کچھ لوگوں کے لیے خطرے کا سامان بن رہا ہے۔آج مذہب کا جنون سر چڑھ کر بول رہا ہے۔انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آرہی ہے۔وہ کردار امر ہونا چاہتا ہے۔گھیسو اور مادھو کی طرح۔سمراٹھ سکندر اعظم یا گوتم بدھ کی طرح،مگر انجام بالآخر موت ہی ہے۔

افسانے کے بطن میں جو سب سے زیادہ متحرک شے ہے وہ ہے کردار کا اپنا وجود۔یہ کردار اپنے وجود کا اعتراف کروانا چاہتا ہے،وہ بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار ذہنی کشمکش میں پڑ جاتا ہے اور اسی پیچ وتاب میں اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ صبح صادق کا وقت ہے۔صبح کی نماز کے بعد افسانہ نگار ذکر واذکار میں مصروف ہوجاتا ہے اور سورج کی کرنیں چاروں طرف بکھر جاتی ہیں۔دریں اثنا دروازے پر کسی نے زور زور سے زنجیر پیٹنی شروع کی اور وقفے وقفے سے بے سر کی آواز بھی لگائے جارہا تھا۔افسانہ نگار نے جب دروازہ کھولا تو اپنے سامنے تیسری جنس کی ایک ٹولی کو پایا۔افسانہ نگار اور ہجڑوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ایک طرف کہانی کار کا اکھڑا اکھڑا لہجہ اور دوسری طرف ہجڑوں کی پر جوش اور عقیدت مندانہ گفتگو۔ دیکھئے کچھ جملے:

''رات میری موسی سپنے میں آ کر کہہ رہی تھی کہ تجھ سے مل کر موسی

والی وہ کہانی لے لیں''

''کون موسی والی کہانی''

''ارے وہی کیا اچھا سا نام بتایا تھا موسی نے ''رات سپنے میں'' اور پھر کمر لچکا کر کچھ سوچنے لگی''

''ہاں ہاں۔۔۔۔۔بے نور ان آنکھ''

''بے نور آنکھیں''میں نے اصلاح کی''

ہاں' وہی۔۔۔۔۔تم نے موسی پر اس میں لکھا ہے نا''

''ارے بابا'' ہجڑوں پر میری کئی کہانیاں ہیں لیکن بے نور آنکھیں۔۔۔۔۔بھٹیاوالی کہانی''

''ہاں۔۔۔۔بھٹیا ہی تو میری موسی تھی۔۔۔میرے کل کی سردارنی''

''تم کیا کروگی اسے لے کے''۔

''موسی نے سپنے میں کہا ہے کہ اسے فریم میں چڑھوا کر دیوار میں لٹکانے کو۔۔۔اومیری اماں۔۔۔سنہرے گوٹے میں۔۔۔سج رہی۔۔''

کہانی لے کر وہ لوگ چلی گئیں لیکن میں کھڑا سوچتا رہ گیا۔۔۔کہ انھیں اپنے پرخوں سے کتنی عقیدت ہے۔۔۔اے کاش۔۔۔۔۔۔''

لفظ''اے کاش'' پر کہانی ختم ہوجاتی ہے اور ہمارے وجود کو جھنجھوڑ جاتی ہے۔ہم سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف اور اس کے

کارنامے سے اس قدر بے پرواہو گئے کہ موقع ومحل کی مناسبت سے بھی انھیں یاد نہیں کرتے۔ ہاں کبھی یاد بھی کرتے ہیں تو بے دلی کے ساتھ یاد کھاوے کی خاطر۔ ہمارا ہر عمل تصنع اور تکلفات سے پر ہے۔ ہمارے یہاں خلوص وصداقت کا فقدان ہے۔ یہاں جو چیز قابل توجہ ہے وہ ہے ہجڑوں کا اپنے پرکھوں اور اپنے ہم جنسوں سے بے پناہ محبت کا اظہار کہ اگر ان کے حوالے سے ایک افسانہ بھی لکھا گیا تو وہ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور اسے حاصل کر کے ہی اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔

''بے حسی'' فنی، تکنیکی اور موضوعاتی طور پر کامیاب اور موثر افسانہ ہے۔ یہاں انھوں نے تیسری جنس کی اپنے اسلاف سے بے پناہ عقیدت ومحبت کو ایک حقیقت پسند کہانی کار کی طرح پیش کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے افسانہ نگار نے زبان وبیان کے برملا اظہار میں فکر وشعور سے کام لیا ہے اور افسانوی فضا کی تشکیل میں لفظیات کے استعمال کا خاص خیال رکھا ہے۔

اس افسانے میں تیسری جنس کی اپنی ذات سے والہانہ محبت اور داخلی اضطراب قاری کے اندر سسپینس پیدا کرتا ہے۔ اس افسانے کا آغاز واختتام قاری کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں از سر نو جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اسلاف کو مدنظر رکھ کر خود احتسابی کے کرب سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر عشرت بیتاب کئی دہائیوں سے افسانہ نگاری کی دنیا میں سرگرمِ سفر ہیں۔ انھوں نے ہر قسم کے جذبے، مشاہدے، تجربے اور احساسات کو اپنے افسانے کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ فن کو وجدان کا درجہ عطا کر کے اپنے موقف میں کامیاب بھی ہوئے۔

عشرت بیتاب اپنے کرداروں کی نفسیات سے آگاہ ہیں۔ وہ ہر طبقے کے

کرداروں کی نفسیاتی الجھن کا تجزیہ ماہر نفسیات کی طرح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے کردار کی پسند و ناپسند یا اس کی ذہنی پختگی و ناپختگی کا علم ہوتا ہے۔ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے کردار کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ہر افسانوی کرداروں کے ساتھ یکساں ہے۔ ان کے افسانوں میں اصلاح معاشرت کا جذبہ بھی ہوتا ہے اور احتجاجی لے بھی۔ وہ اپنے سماج کے تلخ حقائق کو پیش کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کا کردار فرد اور سماج سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ چوں کہ ان کا واسطہ ابتدا ہی سے تند و تلخ حقائق سے رہا ہے اس لیے ان کے افسانے بھی ان کی دلی کیفیات کے ترجمان ہیں۔

عشرت بیتاب ایسے موضوعات کو پیش کرتے ہیں جن پر نگاہ عموماً سبھوں کی پڑتی ہے مگر سوچنے اور منصفانہ رایے کی جرأت نہیں ہوتی۔ عشرت بیتاب نے اس معاملے میں جرأت مندانہ رویہ اختیار کر کے موضوعاتی سطح پر اپنے افسانے کو سماجی و معاشرتی حقائق کا عکاس بنایا ہے ان کے افسانوں میں ایک خاص قسم کی احتجاجی اور طبقاتی بیداری کا احساس ہوتا ہے ان کے افسانے انفرادی کرب سے شروع ہو کر اجتماعی کرب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

بنگال میں سلسلہ قادریہ کی آمد اور ان صوفیوں کی ادبی خدمات

ڈاکٹر سید شاہ وصیق الارشاد علی القادری
اسٹیٹ ایڈیڈ کالج ٹیچر، شعبۂ اردو
کلکتہ گرلس کالج، کولکاتا

Abstract:

Bengal has a rich history of cultural and religious diversity. During the Turko-Afghan era, Sufis and scholars settled in Bengal, spreading love and humanity. From the 7th century Hijri, Shaykhs of Hazrat Ghous-ul-Azam's lineage arrived in the Indian subcontinent, promoting Quadiriya teachings. In 1180 AH, Hazrat Abdullah Al-Jili, the fourteenth generation of Hazrat Syyeduna Abdur-Razzaq Al-Quaderi through the lineage of Hazrat Ghous-ul-Azam, came to Mangalkote, West Bengal along with his sons, Hazrat Ghous e Sani Syed Shah Zakir Ali Al-Quaderi and Hazrat Qutb e Bari Syed Shah Roshan Ali Al-Quaderi. Later, his descendants glorified the city of Medinipur: During 188-83, Hazrat Syed Shah Murshed Ali Al-Quaderi, the great-grandson of Hazrat Ghaus e Sani, came to kolkata and established a monastery "Khanquah Sharif e Quaderiya"and a library. He was a prolific poet of Urdu, Arabic and Persian and wrote under the pen-names Aasi and Jamal. His Diwan, "Hirz e Jaan e Arefaan fi Manaqib e Mahbub e Subhan" comprises of 10,000 couplets. His son, Hazrat Syed

Shah Irshad Ali Al-Quaderi, was also a renowned poet and scholar of multiple languages. The Quadiriya order continues to contribute to Bengal's spiritual heritage, promoting love, humanity, and knowledge. This legacy showcase Bengal's tradition of embracing diversity and promoting cultural and literary development.

سرزمین بنگالہ ہمیشہ سے ہی زبان وادب، تہذیب وثقافت، شگفتگی وزیبائی اور گوناگوں افکاروخیالات کا گہوارہ رہی ہے۔اس خطہ کی یہ روایت دیرینہ ہے کہ اس نے ہر رنگ ونسل، مذہب وملت اور زبان وبیان کے لوگوں کو اپنے سینے سے لگایا اور ان کی علمی و ادبی، ملی وثقافتی، روحانی اور ذہنی وفکری شعور کی بالیدگی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

یوں تو ۸ ویں صدی ہجری میں ہی عربوں نے بنگال سے اپنے تجارتی تعلقات استوار کر لیے تھے لیکن ۱۲۰۴ء میں بختیار الدین خلجی نے جب بنگالہ پر حملہ کیا تو وزراء اور امراء کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کی ایک بڑی تعداد نے بنگال کے شہروں اور قصبوں کو اپنا جائے مسکن بنایا اور لوگوں کو حق کی طرف گامزن کیا۔ان لوگوں نے عالم انسانیت کو جہالت و گمراہی، ظلم وجور، وحشت وبربریت اور ذلت وپستی سے نکال کر امن واطمینان، اخوت و مساوات، عدل وانصاف اور عزم ویقین کی دولت سے مالا مال کیا۔سرزمین بنگالہ ہر دور میں صوفیائے کرام اور علمائے عظام کی دینی تحریک کا مرکز رہی ہے لیکن خصوصی طور پر تُرک و افغان عہد میں عظیم المرتبت صوفیائے کرام نے بنگال کی طرف رُخ کیا جن میں شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ جلال الدین یمنی، شیخ عبداللہ کرمانی، شیخ شرف الدین ابوتوامہ، شیخ بدر الدین عالم، شیخ مظفر شمس بلخی، اشرف جہانگیر سمنانی اور غوث العالم بہاء الدین زکریا ملتانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں اس دور میں اس خطہ مشرق میں سید ناسراج عثمانی، شیخ علاؤ الحق پنڈوی، نور قطب عالم پنڈوی اور شیخ حمید دانشمندی بردوانی جیسے اولیاء

عظام وقابل صد احترام ہستیاں جلوہ افروز ہوئے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر جاوید نہال رقم طراز ہیں:

''صوفیائے کرام اور مشائخ نے جس طرح جنوبی ہند اور شمالی میں اپنے مراکز قائم کیے تھے اور لوگوں کو سماجی نا انصافی سے نجات دلائی اسی طرح بنگال کے منگل کوٹ، پنڈوا، مدنی پور، جہانگیر نگر، ڈھاکہ اور میمن سنگھ میں بھی اپنے تبلیغی مراکز قائم کیے تھے۔'' (نقش جاوید از ڈاکٹر جاوید نہال، صفحہ نمبر ۱۲۴، سن اشاعت ۱۹۹۹ء)

ساتویں صدی ہجری کے اوائل سے ہی برصغیر ہند میں حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی کے سلسلے کے شیوخ کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو سلسلۂ قادریہ کی تبلیغ اور انسانیت کا پیغام دینے کے لیے کوشاں رہے ان میں سید نور الدین مبارک غزنوی اور حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے اسماء گرامی مشہور و معروف ہیں۔ پھر حضرت غوث الاعظم کی نسل شریف میں حضرت قُمیص قادری (متوفی ۹۹۲ھ مدفون بہ قصبہ سادھورہ ضلع انبالہ مشرقی پنجاب) کی ذات اقدس بہت نمایاں ہے۔ان کے جد امجد حضرت سید تاج الدین محمود قادری رازقی پہلے پہل بغداد سے بنگالہ آخر نواح گوڑ ضلع مالدہ میں مقیم ہوئے اور پھر آپ کا سلسلہ، سلسلۂ قادریہ قُمیصیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ پھر اس سلسلے کے ایک اور بزرگ حضرت سید عطا اللہ بغدادی کا بھی ذکر آتا ہے۔ جنہوں نے بغداد سے بنگالے کا سفر کیا اور پنڈوا ضلع ہگلی میں حضرت نور قطب عالم چشتی نظامی (متوفی ۸۵۱ھ) کے پاس حاضر ہوئے اور عرصۂ دراج تک وہیں مقیم رہنے کے بعد قصبہ بہار شریف تشریف لے گئے۔ان کے علاوہ حضرت امیر سید محمد قادری (متوفی ۹۴۰ھ مدفون بہ قربہ امجھر ضلع گیا) بھی سلسلۂ قادریہ کے بزرگ تھے جو بغداد سے روانہ ہو کر پہلے ملتان آئے وہاں سے سریر پور ہوتے ہوئے بہار کے امجھر میں مقیم ہوئے۔ اس زمانے میں بہار کوئی الگ

ریاست نہیں تھی بلکہ بنگال کے ماتحت ہی مانی جاتی تھی۔

حضرت غوث الاعظم کی اولاد گرامی صدیوں تک قادریت کا پیغام لے کر برصغیر ہند میں آتی رہی اور ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلتی رہی۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں آپ کی نسل شریف نہ پہنچی ہو۔ اب ہم بنگال میں خاندان قادریۂ عالیہ رزاقیہ کی ایک اہم شاخ کا تذکرہ کریں گے جو سینہ بہ سینہ حضرت غوث الاعظم کے تصرف باطنی سے سرشار ہے جو بغداد سے آکر یہاں آباد ہوئی اور جس نے قادریت کا بڑا ہی منور چراغ روشن کیا اور سارے مشرقی و مغربی بنگال کو منور کیا اور آج تک اس خاندان عالی وقار کا فیض تقسیم ہند کے بعد بھی دونوں بنگالوں میں جاری وساری ہے۔

حضرت غوث الاعظم کے منجھلے شہزادے حضرت سید نا و مولانا عبد الرزاق القادری کی نسل میں پندرویں پشت پر حضرت سیدنا و مولانا عبداللہ الجیلی ہیں جو آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے یعنی ۱۱۸۰ھ مطابق ۶۷-۱۷۶۶ء میں حسب ایمائے غیبی برائے رشد و ہدایت اپنے چار شہزادے یعنی حضرت غوث ثانی سید شاہ ذاکر علی القادری، حضرت سید شاہ غلام حسین القادری، حضرت سید شاہ رجب علی القادری، حضرت قطب باری سید شاہ روشن علی القادری اور ایک کم سن پوتے حضرت قطب ربانی سید شاہ طفیل علی القادری اور چند مستورات عالی وقار کو ساتھ لے کر بنگال تشریف لائے اور بردوان ضلع کے موضع منگل کوٹ میں سکونت پذیر ہوئے۔ حضرت سیدنا و مولانا عبداللہ الجیلی چند روز ان اطراف میں رونق افروز رہے پھر اپنے دو شہزادہ گان عالی وقار کو یہاں رکھ کر مع دیگر کے وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔ ہندوستان میں اس خاندان عالیشان کے ورود کی تاریخ موضع پٹاس پور ضلع مدنا پور (مغربی بنگال) سے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت بنگال کے حجاج اسی راستے سے بندرگاہ تک پہنچتے تھے۔ اس لیے جسٹس سید محبوب مرشد نے اپنی انگریزی

کتاب ''گلستانِ قادری'' میں لکھتے ہیں:

" H e and his party probably landed in Chandbali or some other part in Orissa. On their way to Mangalkote they reached the village of Pataspur in the district of Midnapur. In those days this was on the route to Pilgrimage from Bengal to Mecca." (Gulistan-e-Qaderi by Syed Mahbub Murshid, Pg.28, August-1946)

(گلستان قادری از سید محبوب مرشد، صفحہ نمبر ۲۹ سن اشاعت اگست ۱۹۴۶ء)

اس خاندان کے حلقہ بگوشوں میں بہت سے اہل قلم حضرات نے اپنے پیران سلسلہ کے حالات پر رسالے یا کتابیں لکھی ہیں۔لیکن سبھوں نے ابتداء پٹاس پور سے ہی کی ہے۔

حضرت غوث ثانی سید شاہ ذاکر علی القادری، منگل کوٹ، بردوان ہی کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا اور وہیں سے مختلف اضلاع مثلاً ہگلی، مرشد آباد، بیربھوم اور مدنا پور وغیرہ تشریف لے گئے اور ان علاقوں میں لوگوں کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کی۔ڈاکٹر محمد یحییٰ تمیزی نے اپنی انگریزی کتاب "Sufi Movement in Eastern India" رقم طراز ہیں:

" Through the efforts of Zakir Ali and other members of his family, the Qadiriya order did great service in Bengal. They had thousands of followers, many of whom noted officials and scholars," (Sufi Movements in Eastern India by

Dr. Mohammad Yahya Tamizi, Pg 80, 1992)

(صوفی موومنٹ ان ایسٹن انڈیا از ڈاکٹر یحییٰ تمیزی، صفحہ نمبر ۸۰، سن اشاعت ۱۹۹۲ء)

لہٰذا اس علاقے میں اس وقت علماء وفضلا کی کثیر تعداد تھی مگر ان میں بیشتر فقر و تصوف کی روحانی حلاوتوں سے بے بہرہ تھے۔ آپ نے پہلی توجہ ان کے دلوں کو روحانی سوز و گداز کی دولت بخشنے کی طرف فرمائی۔ چنانچہ بہت سے علماء آپ کے روحانی فیض سے قادریت کے مبلغ بن گئے۔ آپ نے منگل کوٹ ہی میں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور انتہا ہی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ آپ کا وصال ۸۱ برس کی عمر میں ۱۱۹۲ھ میں ہوا۔ منگل کوٹ ہی میں آپ کا مزار اقدس فیض بخشی ہے۔ حضرت غوث ثانی کے برادر حضرت قطب باری منگل کوٹ سے ضلع پورنیہ (بہار) تشریف لے گئے اور وہیں ۱۱۹۴ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک موضع شہید گنج، پورنیہ میں مرجع خلائق ہے۔

بعد ازاں حضرت قطب باری کے شہزادے حضرت قطب ربانی نے شہر مدناپور کو رونق بخشی اور وہیں بود و باش اختیار کی۔ جہاں ان کے شہزادے حضرت اعلیٰ حضور سید نامہر علی القادری کی ولادت ہوئی۔ آپ مدناپور میں ہی رہے اور وہاں ایک خانقاہ اور مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور نہایت ہی فیاضی کے ساتھ سلسلہ کی خدمت کرتے رہے۔ آپ نے ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں اس دارِفانی سے رحلت فرمائی۔ اس کے بعد آپ کے شہزادے حضرت حضور پورنور سید شاہ مرشد علی القادری نے جذبۂ تبلیغ کے ماتحت شہر مدناپور کی اقامت ترک کی اور ۸۳-۱۸۸۲ء میں اس وقت کا دارالسلطنت ہند یعنی کلکتہ آ کر اس مرکزی شہر کو اپنا مستقر بنایا اور مستقلاً کلکتہ کی بود و باش اختیار فرمائی۔ آپ نے یہاں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ بھی بنوایا جہاں عربی، فارسی اور اردو کی نادر کتابوں اور قلمی

نسخوں کو جمع کیا بہت سے مخطوطات آپ نے خدابخش لائبریری پٹنہ اور رام پور رضا لائبریری سے نقل کروائے تھے۔آپ نے اپنے زبردست روحانی تاثرات اور بلند کردار سے ہزاروں لوگوں کو حق کی طرف متوجہ کیا اور ان کے قلوب کو حلاوت ایمانی اور ذوقِ عرفانی کی لذت بخشی۔انگریزی سرکار نے بعدازاں آپ کی خانقاہ کی مناسبت سے راستے کا نام ''خانقاہ شریف لین'' رکھ دیا جو آج بھی خانقاہ شریف لین کے نام سے ہی واقع ہے۔اس خانقاہ میں آپ ۲۷ رشوال ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۷ رفروری ۱۹۰۱ء کو ۲ بجے شب وصال فرمایا۔ نمازِ جنازہ آپ کی وصیت کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کے والد حضرت مولانا خیرالدین نے پڑھائی۔مزار پور نور مدنا پور میں واقع ہے۔

حضرت حضور پور نور سید شاہ مرشد علی القادری اردو، فارسی اور عربی زبان میں خاصی دست گاہ رکھتے تھے۔اردو میں پوری فنی و علمی بصیرت کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔ آپ نے اپنا تخلص عاصی و جمال استعمال کیا ہے آپ کا اردو میں مکمل دیوان ہے جس کا عنوان ''حرز جان عارفاں فی مناقب محبوب سبحاں'' ہے یعنی یہ مناقب حضرت غوث الاعظم پر مبنی ہے جو مکمل عارفانہ وصوفیانہ شاعری پر مشتمل ہے۔جس میں تقریباً دس ہزار اشعار شامل ہیں اور یہ دیوان ۱۳۱۹ھ میں آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند ارجمند نے شائع کروایا تھا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کی لیکچرار ڈاکٹر سوبھارانی باسو نے اپنی کتاب "Modern Indian Mysticism - A comparative & critical study" میں آپ کی زندگی و شاعری پر مستقل باب بعنوان ''حضور مہاراج'' قائم کیا ہے جس میں آپ کی شاعری کے بارے میں وہ لکھتی ہیں :

"The collection of these deeply religious poems is

accepted as a very valuable and interesting work shedding light on the doctrines of sufism or Islamic mysticism."

(Modern Indian Mysticism by Dr.Subharani Basu Vol-II Pg. 412, 1974)

(موڈرن انڈین میسٹیسزم از ڈاکٹر سوبھارانی باسو، جلد- ۲، صفحہ نمبر ۴۱۲، سن اشاعت ۱۹۷۴)

آپ نے حمد، نعت، مناقب یا مضامین تصوف کے سوا اور کوئی مضمون اپنے اشعار میں نہیں باندھا ہے۔ اصول شاعری کی تمام تر خوبیاں آپ کے کلام میں ملتی ہیں۔ برجستہ تشبیہات دلچسپ استعارات اور انواع واقسام کی تجنسیات کو آپ نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے جس میں تکلف وتصنع کی بو تک نہیں آنے پائی ہے۔ آپ کی طبیعت میں اس قدر آمد تھی کہ ایک ایک غزل پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ اشعار کی ہوتی تھی جس میں حسن مطلع کے اشعار دس دس اور بارہ بارہ ہوتے تھے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اس کے در پر مورہی کا رتبہ حاصل ہو مجھے
میں بنوں اپنے زمانے کا سلیماں یا خدا

شیریں جو عیسیٰ لب جاناں کا نام تھا
پڑ جاتی کیوں نہ سنکے تن کوہکن میں روح

مر کے پیدا بھی ہو بہزاد تو نقشہ نہ کیجیے
ثانی ان کا تو کہیں خلق میں پیدا نہ ہوا

صدائے نامِ محی الدین سے مردے ہم جِلاتے ہیں
سنادے اے اجل جا کر یہ مژدہ ابنِ مریم کو

آپ نے اردو شاعری کی بعض زمینیں خود ایجاد کی ہیں جیسے روح یا برزخ وغیرہ۔ ان زمینوں پر آپ کو قدرت حاصل تھی اور بے تکلفی کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر دم رواں ہے خدمت غوث زمن میں روح
وہ جان آ کے بن گئے میرے بدن میں روح

مر کے بسینگے روضۂ رشک جناں میں ہم
بعد فنا رہے گی نہ گور و کفن میں روح

کیوں بے قرار ہے قفس تن میں اس قدر
ہے چند روز اب ترا یاں پر قیام روح

بناتی ہے ہمیں ہم چشم موسیٰ پیر کی برزخ
دکھاتی ہے جمال حق تعالیٰ پیر کی برزخ

نتیجہ قرب حق ہے اور مرشد برزخ کبریٰ
ہوئی کبریٰ سے پھر یہ شکل صغریٰ پیر کی برزخ

اسی پردے میں اس پردہ نشیں کی اک جھلک دیکھوں
گرادے آنکھوں پر غفلت کا پردا پیر کی برزخ

آپ کو رندانہ غزل گوئی سے سخت نفرت تھی اس لیے کہ آپ کا عشق صرف اور صرف خدا اور محبوبِ خدا سے وابستہ تھا یہ ایسا عشق تھا جس کے لیے عارفانِ خدا سالہا سال جنگلوں میں، پہاڑوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اپنے محبوب حقیقی کی تلاش میں سر دھنتے ہیں تب جا کے کہیں انہیں خدا کے عرفان کا پتہ چلتا ہے، خدا کی ولا نصیب ہوتی ہے لہٰذا آپ خود فرماتے ہیں:

نفرت ہے غزل گوئی رندانہ سے ورنہ
کچھ عجز طبیعت نہیں اس مدح سرا کا

عشق حقیقی اور فنا و بقا کے عنوان سے چند اشعار پیش خدمت ہے :

راہ اخلاص کی لے پیروی شیطان چھوڑ
طاعت حق بھی کر اے نفس لعیں تھوڑی سی

بقا مطلق نہ ہستی میں رہے باقی عطا یوں ہو
فنا ثم الفنا یا غوث محی الدین جیلانی

وحدت ہوئی مقید کثرت جو مطلقاً
مطلق تھی قید ہو گئی آ کر بدن میں روح

دل اب زندہ ہوا یا غوث محی الدین جیلانی
مرے نفس و ہوا یا غوث محی الدین جیلانی

رہے یاد خدا یا غوث محی الدین جیلانی
بھلا دو ما سوا یا غوث محی الدین جیلانی

آپ نے پوری زندگی میں کبھی کسی کو اپنا کلام پڑھ کر نہیں سنایا۔ شعر وضع کرتے اور رکھ لیتے۔ اکثر شاعروں کو دیکھا گیا ہے کہ شعر نظم کرتے وقت گنگناتے رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا بلکہ تسبیح پڑھتے رہتے تھے اور درمیان میں پانچ پانچ چھ چھ اشعار ایک ساتھ لکھ ڈالتے تھے اس طرح اتنی بڑی بڑی غزلیں پوری ہو جاتی تھیں۔

آپ کی شاعری میں معرفت الٰہی کے رموز سراپا ملتے ہیں اور اردو شاعری کی کوئی بھی ایسی صنعت نہیں جو آپ کی غزلوں میں نہ ملے۔ ان غزلوں میں محاوروں کا استعمال، ندرت بیاں، تازگی و شگفتگی و دلکشی خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ آپ اپنے جد اعلیٰ حضرت غوث الاعظم ہر فنا تھے ان کے پرتو کامل تھے ان سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے لہٰذا آپ کی غزلوں کے ہر شعر میں جذبات، عقیدت و احترام امنڈت آئے ہیں۔ حدیث، تفسیر، فلسفہ، منطق اور دوسرے علوم دینی و دنیاوی پر بھی آپ کی گہری نظر تھی جس کا اثر آپ کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔ آپ نے بہ حسن و خوبی قرآن و حدیث کا حوالہ دیا ہے اور اپنے اشعار کو فلسفہ کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ نمونے کے طور پر اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

قرآں کی قسم یاد مجھے آتی ہے وہ زلف
پڑھتا ہوں جو واللیل کی تفسیر کسی وقت

ہے رگ گردن سے بھی نزدیک کیوں جاتا ہے دور
قاصد دل نحن اقرب ہے نشان کوئے دوست

ازل سے پی کے جام لاسموتوں اولیاء آئے
رہیں گے تا ابد عمر ان کی عمر لایزالی ہے

عرش پر ٹوپی اچھالے گا ترا شیدائے مست
روضۂ انور کی جانب جب اچھلتا جائے گا

شوق کی گرمی میں پنکھا اپنی آہ سرد سے
زائیران روضۂ اقدس کو جھلتا جائے گا

حمد گوئی سے دل آئینہ بنا نام خدا
بولتا ہے آج کیا طوطی مرا نام خدا

ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی کتاب ''انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب'' میں آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کی عارفانہ غزلوں سے ان کے ایک اچھے غزل گو شاعر ہونے کا نشان ملتا ہے، ان کا کلام صوفیانہ شاعری میں ایک اضافہ ہے۔'' (بنگال کا اردو ادب انیسویں صدی میں از ڈاکٹر جاوید نہال، صفحہ نمبر ۲۸۹، سن اشاعت ۱۹۸۴ء)

حضرت حضور پورنور کے وصال کے بعد ان کے شہزادۂ گرامی حضرت غوث زمانہ سید شاہ ارشاد علی القادری نے بھی اس سلسلے کی تبلیغ بڑے ہی انہماک سے کیا ہے۔ آپ کی ولادت ۳؍محرم الحرام ۱۳۰۱ھ مطابق ۴؍دسمبر ۱۸۸۳ء میں ۵۱، تالتلہ لین، کولکاتا-۱۶ میں ہوئی۔ ۷۱؍سال کی عمر شریف تک اس خانقاہ کی روایت کو آب و تاب کے ساتھ ظاہر کرتے رہے۔ آپ کی ذات اقدس سے سلسلۂ قادریہ کی مغربی و مشرقی بنگال میں بہت بڑی اشاعت ہوئی۔ آپ کا وصال ۲۱؍جمادی الاوّل ۱۳۷۲ھ مطابق ۶؍فروری ۱۹۵۳ء کو کلکتہ میں ہوا۔ آپ کو بھی اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ آپ ایک فصیح و بلیغ شاعر تھے اور جمیل تخلص کرتے تھے اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پوری فنی

مہارت کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔ آپ کو اہل بیعت اور حضرت غوث الاعظم سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی ۔ آپ نے اردو اور فارسی میں ہزاروں کی تعداد میں نعتیہ غزلیں، منقبتیں اور نوحے کہے ہیں جو مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔

طوطیِ بنگالہ، غالب ثانی رضا علی وحشت نے آپ کی مدح میں یوں کہا تھا:

میں حضرت جمیل کا وحشت ہوں معتقد
جن کی کمک پہ آٹھ پہر غوث پاک ہیں

آپ کے اشعار شگفتگی، سلاست اور متانت تخیل کے ساتھ ساتھ رموز وتصوف کے شاہ کار بن گئے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا کا عرش ہے لاریب کاشانہ محمد کا
بلاشک نظم قرآنی ہے افسانہ محمد کا

مجھے کیا وادیٔ ایمن سے مطلب طور سینا سے
کہ ہے قلب حزیں میرا جلوخانہ محمد کا

ہوں قطرہ مگر مجھ کو حقارت سے نہ دیکھو
اس قطرے کو کیا دامن دریا نہ ملے گا

شیدائے عنایات تو مل جائیں گے تم کو
عاشق کوئی انداز ستم کا نہ ملے گا

پروفیسر ڈاکٹر خراسانی نے آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" In the entire range of devotional poetry of Arabic, Persian and Urdu his compositions are truly unique" (Syedona Huzur Pak by Dr. S. S. M. A. Khorasani Pg. 18,1986)

(سیدنا حضور پاک از ڈاکٹر ایس-ایس-ایم-اے خرامانی، صفحہ نمبر ۱۸، سن اشاعت ۱۹۸۶ء)

سالکان طریقت کا مقصد اپنے رہبر ومحبوب تک پہنچنا اور خود کو حب الٰہی کی رہنمائی اور ذات واجب الوجود کی قربت میں پہنچانا ہوتا ہے۔ حضرت غوث زمانہ نے بھی انہیں خیالات کا اظہار اپنے کلام میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ جس سے ان کے دل ودماغ کی وارفتگی نمایاں ہوجاتی ہے۔ پاکیزہ جذبات، سنجیدہ رجحانات، بلند خیالات ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے یہی وہ خصوصیت ہے جس کے سہارے شاعر راہ طلب میں سالہا سال کی مشق وریاضت کے بعد عشق حقیقی کی روحانی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مٹ کر کسی کی راہ میں امید بڑھ گئی
راہِ وفا میں اور مٹاتے تو خوب تھا

دل کو نہیں قرار وسکون وشکیب آج
خالی مکاں ہے آپ جو آتے تو خوب تھا

ہے خلقت خلاق پہ احسان محمد
ارفع ہے بہت مرتبہ وشان محمد

صد شکر جمیل اپنا ہے دل شوق سے لبریز
یعنی کہ دل و جاں سے ہوں قربان محمد

یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ملک اور خاص طور پر سرزمین بنگال اخوت و بھائی چارگی کی آماجگاہ ہمیشہ رہی ہے جہاں رشی منیوں اور صوفی سنتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ مسلک صوفیہ عالم انسانیت کے لیے ایک عظیم تحفہ اور سرمایہ ہے ساتھ ہی حیات و زیست کا ایسا معجزانہ ارمغان ہے جو معاشرت انسانی میں عدل و انصاف، اخلاق و کردار، الفت و محبت اور عزم و یقین کی روح پھونکتی رہے گی۔ شاید اسی وجہ سے مفکر اسلام سر ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا تھا:

نہ پوچھو ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

خواجہ احمد عباس کی صحافتی زندگی

ڈاکٹر نگہت پروین
سابق گیسٹ لیچرر، شعبۂ اردو
گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کولکاتا

Abstract:

The name of Khawaja Ahmed Abbas in Urdu literature needs no introduction. He was an important pillar in progressive movement and a multitalented person who left his deep imprints on almost all genres of Urdu prose.

As a fiction writer, novelist, dramatist he has established his identity as an authority and left his deep impressions in the filed of journalism.

He was inclined towards journalism right from childhood he astonished his elders by publishing a handy / manual journal and at an early age of fourteen.

He moved to Delhi with his father during his college vacation where Abbas began his career as a journalist at the "National Call," a New Delhi-based newspaper. At the "National call," Abbas was entrusted with the responsibility of reporting and editing a responsibility he exercised in a very good and honest manner. He used to work twelve hours a day for this newspaper. Even though he did not get any payment for this job but he did this to get good experience of journalism.

During his LLB studies he published his English weekly The Aligarh Opinion "which was an instant hit. After completing his Law studies, instead of making advocacy a profession he went on to Delhi and joined The Bombay Chronicle in 1935 as a political correspondent and later became a film critic for the newspaper and started a weekly column called "Last Page."

In 1947, the publication of "The Bombay Chronicle " closed and then he got attached with "Biltz." He wrote the last page in Biltz which quickly became familiar in public. Such was the craze that people used to became impatient and eagerly waited for his columns.

A few years later, Urdu and Hindi editions of "Blitz" were also released. In the Urdu edition, he started writing columns in the last page under the name "Azad Qalam." The "Azad Qalam" is considered the lifeline of the Blitz. In the beginning, people thought that Azad Qalam is only a translation of last page from the English version of the newspaper, but it was indeed a standalone piece of work for Urdu version only. There was a difference between the two in terms of theme and content.

Azad Qalam had a distinct identity in the world of Urdu journalism. It would be not wrong to say that Urdu journalism was given a new tone by Khwaja Ahmed Abbas through "Azad Qalam"

Undoubtedly, Abbas started a new era in Urdu journalism and never allowed the boldness of his pen to be forced.

اردو ادب میں خواجہ احمد عباس کا نام محتاج تعارف نہیں وہ اردو زبان و ادب خصوصاً ترقی پسند ادب کے ایک اہم ستون ہیں وہ ایک کثیر اجہات شخص تھے جنہوں نے اردو کی نثری ادب میں تقریباً تمام اصناف پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

بحیثیت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار اپنی پہچان کو مستحکم کی ہے مگر ایک اور میدان صحافت کا ہے جس پر ان کا نقش بڑا گہرا ہے۔ صحافت وہ میدان ہے جس سے ان کی دلچسپی بچپن میں ہی شروع ہوگئی جب انہوں نے محض 14 سال کی عمر میں ایک دستی اخبار نکال کر اپنے بزرگوں کو چونکا دیا۔

1933 میں خواجہ احمد عباس نے بی-اے کا امتحان فرسٹ دویژن پاس کیا اور اپنے والد کی خواہش پر ایل-ایل-بی لا کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ بی-اے اور ایل-ایل-بی کے بیچ کا وقفہ خواجہ احمد عباس کی صحافتی تربیت کا دور تھا یہی سے انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔

کالج کی تعطیل کے دوران وہ اپنے والد کے پاس دہلی چلے گئے اس وقت دہلی میں دو قوم پرست اخبار ''ہندوستان ٹائمز'' اور ''نیشنل کال'' نکلتا تھا۔ خواجہ احمد عباس ''نیشنل کال'' سے منسلک ہوگئے جس کے ایڈیٹر جے۔ این ساہنی تھے۔ ''نیشنل کال'' میں خواجہ صاحب کو رپورٹنگ اور ادارت کی ذمہ داری سونپی گئی جنہیں انہوں نے بخوبی انجام دیا۔ وہ روزانہ 12 گھنٹے کام کرتے تھے وہ خود اپنی خودنوشت سوانح عمری 'I am not Island'' میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ صبح وشام ہر ہاسٹل، تھانہ اور بہت سے جگہوں سے رپورٹ لیکر شام سے آدھی رات تک ایڈیٹنگ کر کے اشاعت کے لئے دیتے تھے۔ یعنی ان کو جو خبریں موصول ہوتی تھی انہیں کاٹنا چھاٹنا اور انہیں اشاعت کے لائق بنانا انہیں کی ذمہ داری تھی چونکہ ان کا گھر ''نیشنل کال'' کے دفتر سے قریب تھا

انہیں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی تھیں حالانکہ اس کام کے لیے انہیں کوئی معاوضہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ بغیر تین مہینے اس اخبار میں محنت کئے۔ اس کام کے لئے انہیں کوئی معاوضہ تونہیں ملا مگر صحافت کا پکا تجربہ انہیں حاصل ہو گیا۔

ایل-ایل-بی کے مطالعہ کے دوران اپنا انگریزی ہفتہ وار اخبار'' علی گڑھ اوپینین'' "The Aligarh Opinion" جاری کیا جو بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس وقت اس رسالہ کی قیمت فی پرچہ 2 روپیہ اور سالانہ 100 روپیئے تھی حالانکہ اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی سے علیگڑھ میگزین شائع ہوتا تھا وہ اس کے ایڈیٹر نہ بن سکے اس لئے انہوں نے اپنا ذاتی اخبار نکالا۔

خواجہ احمد اعباس نے جب وکالت کا امتحان پاس کر لیا ان کے والد کی خواہش تھی کہ خواجہ صاحب وکالت کو پیشے کے طور پر اختیار کرے اور ایک اچھے وکیل ہے مگر خواجہ احمد عباس کو صحافت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ اپنے والد کی خواہش کو پورا نہ کر سکے اور ممبئ چلے گئے اس وعدے کے ساتھ کہ اگر تین مہینے میں صحافت کے میدان میں قدم نہ جما سکے تو واپس آ کر صحافت شروع کر دینگے۔

ممبئ میں انہوں نے ایک انگریزی اخبار ''بامبے کرانیکل'' میں بحشیت رپورٹر ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت ''بامبے کرانیکل'' جنوبی ہندوستان کا اکلوتا اخبار تھا۔ جو انگریزی زبان سے تعلق رکھنے کے باوجود ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتا تھا خواجہ احمد عباس کو یہاں 20 روپے ماہانہ ملتا تھا۔ مگر ان کی محنت کو دیکھ کر تین مہینے میں ان کی تنخواہ 50 روپئے کر دی گئی۔

خواجہ احمد عباس ''بامبے کرانیکل'' میں بحشیت رپوڑٹر تھے بعد میں فلمی نقاد کی

حیثیت سے اسی اخبار میں سنڈے ایڈیشن کے فلمی تبصرے لکھنے لگے۔ یہ تبصرے اتنے تلخ آمیز ہوتے تھے کہ فلم پروڈیوسروں میں ایک کہرام مچ گیا۔ چنانچہ فلم سازوں نے ''بامبے کرانیکل'' کے ایڈیٹر کو صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ اگر خواجہ احمد عباس سے فلمی تبصرے لکھوانہ بند نہیں کروائے تو ''بامبے کرانیکل'' کو اشتہار دینا بند کر دینگے۔ فلم سازوں کی دھمکی سے اخبار کے ایڈیٹر نے ایک دوسرے رپورٹر کو فلمی تبصرے لکھنے کے لئے مقرر کیا اور عباس کو ''سنڈے ایڈیشن'' کا انچارج بنا دیا گیا۔ خواجہ احمد عباس ''سنڈے ایڈیشن'' کے آخری صفحہ میں Last page کے نام سے سیاسی اور اقتصادی تبصرے لکھنے لگے۔

1947 میں ''بامبے کرانیکل'' کی اشاعت بند ہوگئی تو خواجہ احمد عباس ہفت روزہ ''بلٹز'' "Blitz" سے وابستہ ہو گئے جس کے ایڈیٹر آر کے کرنجیا تھے۔ انہوں نے عباس کو بلٹز کے لئے بھی آخری صفحہ Last page لکھنے کو کہا۔ خواجہ احمد عباس بلٹز میں بھی Last page لکھنا شروع کیے۔ بہت جلد یہ کالم مقبول ہو گیا۔ لوگ بے صبری سے کالم کا انتظار کرنے گئے۔ خواجہ احمد عباس تاحیات بلٹز میں Last page کے آخری صفحہ کے نام سے لکھتے رہے انہوں نے خود اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مرتے دم تک یہی لکھنے اور کرنے کا ارادہ ہے اگر زندگی نے وفا کی تو میرا خیال ہے کہ دفعتاً مرنے کی وجہ سے لاسٹ پیز لکھ کر مروں گا تا کہ اس کی سرخی ہو Last page اور ایسی ہی اس کی سرخی ہو''

۱۹۶۲ء میں ہندی کا بلٹز ایڈیشن نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۶۳ء میں اردو میں بھی جاری ہو گیا۔ خواجہ احمد عباس اس میں بھی آزاد قلم کے عنوان سے Last page میں لکھنے لگے ایڈیٹر کے اس معاہدہ کے ساتھ کہ جو مضمون وہ لکھے اس میں کانٹ چھانٹ نہ ہو بلکہ من عن ویسے ہی شائع کر دیا جائے بہت جلد آزاد قلم کے کالم مشہور ہو گئے اور قارئین اس کا

بے صبری سے انتظار کرنے لگے بلکہ آزاد قلم کو بلٹز کی جان سمجھا جانے لگا اور حد تو یہ ہوا کہ بلٹز کے قارئین آزاد قلم کے کالم پڑھنے کے لئے آخری صفحہ سے پڑھنا شروع کرتے تھے کیونکہ آزاد قلم آخری صفحہ پر ہوتا تھا۔ آزاد قلم کا تذکرہ فکر تونسوی اپنے ایک مضمون میں اس طرح سے ذکر کرتے ہیں:

''بمبئی کے ہفتہ وار بلٹز کو قارئین اس وقت تک ادھورا سمجھتے ہیں جب تک کہ ان کا آخری صفحہ کا کالم ''آزاد قلم'' موجود نہ ہو اور خواجہ صاحب خود اپنے آپ کو ادھورا سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ آزاد قلم لکھ کر قارئین کو پیش نہ کرتے، پانی کی قلت ہو یا ہندو مسلم فسادات، حاکموں کی آمرانہ ڈپلومیاں ہو یا گولی لاٹھی پر دار جمہوریت ہو۔ خواجہ صاحب کی سوشلسٹ روح ان کے کالم میں عوام کا درد بن کر تڑپاتی اور ٹرپانے کی کیفیت کالم میں اس خیال سے پیدا ہو جاتی کیونکہ کالم نگار کے خیالات کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتے''

اردو صحافت کی دنیا میں ''آزاد قلم'' کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ خواجہ احمد عباس آزاد قلم کے ذریعہ اردو صحافت کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ شروعات میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آزاد قلم Last page کا ترجمہ ہے مگر ایسا نہیں تھا Last page میں سیاسی، معاشرتی، ہندوستانی تہذیب اور بین الاقوامی مسائل کی عکاسی ہوتی تھی جبکہ آزاد قلم زیادہ تر ملک کی سیاسی سماجی الجھنوں کے بارے میں ہوتا تھا۔ دونوں میں کافی فرق تھا مواد کے اعتبار سے بھی اور تھیم کے اعتبار سے بھی۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

آزاد قلم کے موضوعات کا دائرہ بے حد وسیع تھا اس میں ملک میں ہونے والے عدم مساوات، بھوک وافلاس، مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ فسادات، ذات پات کا مسلۂ، قحط دہشت گردی، حکومت پر طنز، علاقائی جھگڑے، چھوٹ چھات کا مسلۂ، عورتوں کے

حقوق اوران جیسے ہزاروں مسائل پر اپنے بے باک قلم اٹھا کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا اور اہل وطن کوان موضوعات پر غور وفکر کی دعوت دی۔

خواجہ احمد عباس فرقہ پرستی پر بار بار لکھتے تھے اور اپنے اہل وطن کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ فرقہ پرستی ختم نہیں ہوئی تو وہ ایک دن ہندوستان کو کھوکھلا کر دے گی۔ اپنے ایک کالم لکھتے ہیں:

''میں نہ ہندو کو برا کہہ رہا ہوں اور نہ مسلمانوں کی حمایت کر رہا ہوں، میں اس زہریلی فرقہ پرستی کی مذمت کر رہا ہوں جو کسی چہرے پر داڑھی لگا کر آتی ہے کبھی سر پر چوٹی لگا کر، کبھی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے نام پر مسلمانوں کو ورغلاتی ہے، کبھی جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے نام پر ہندوؤں کو بہکاتی ہے۔ یہ وہی زہریلی ذہنیت ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون کیا''

انہوں نے آزاد قلم میں ملک اپنے ملک کے سیاسی سماجی رہنماؤں، شاعروں اور ادیبوں کے انتقال پر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اردو کے معروف نقاد سید احتشام حسین کے انتقال پر اس طرح سے عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

''جب کوئی ادیب، کوئی نقاد کوئی شاعر مرتا ہے تو اس کا افسوس اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کو ہی نہیں پوری زبان کے پڑھنے والوں کو ہوتا ہے اور جب مرنے والا سید احتشام حسین مرحوم جیسے پایہ کا ادیب اور نقاد ہو تو ایک زبان بیوہ ہو جاتی ہے ایک ادب یتیم ہو جاتا ہے اور ہزاروں لاکھوں اردو پڑھنے والے اردو سے پیار کرنے والا اس کے ماتم میں شریک ہو جاتا ہے''۔

اس طرح کے بہت سے مسائل اور موضوعات آزاد قلم کے کالم میں ہمیں پڑھنے

کو مل جائیں گئیں۔ وہ ''آزاد قلم'' میں طنز سے بھی کام لیتے تھے ان کی طنز اتنا زبردست ہوتا کہ لوگ تلملا اٹھتے۔ گرچہ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے کالم کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرے۔

بلاشبہ خواجہ احمد عباس اردو صحافت کو ایک نئی سمت عطا کی اپنے قلم کی بے باکی کو کبھی بھی مجبور نہیں ہونے دیا اور اسے نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

مجنوں گورکھپوریؔ اور ان کے افسانوں میں رومانیت کا تصور

ڈاکٹر زاہدہ پروین
اسٹیٹ ایڈیڈ کالج ٹیچر، شعبۂ اردو
بی۔سی۔کالج۔آسنسول

Abstract:

When Urdu Fiction writing was in its initial stages, at that time the impact of Romanticism was very big on literary scene of India. The influence of the subtle sentiments of romanticism was seen directly on Urdu fiction.

Many Romantic Fiction writers appeared. Among them, Majnu Gorakhpuri's name deserves to be written with golden letters. He is such a figure in the history of Urdu fiction writing, who was influenced by Western literature and played an important role in bringing its thoughts and ideas to East. Majnu Gorakhpuri was very much influenced by English fiction writer Thomas Hardi.

The study of Majnoo Gorakhpuri's fictions reveals that the atmosphere of his fictions is filled with sorrow and pain. He brought a new style with help of these elements. His stories are also filled with feelings of love and affection. Apart from love, literature, aesthetics, philosophy and psychology are also seen in the stories of Majnu Gorakhpuri. Majnu Sahib was the owner of a revolutionary mind set. He wanted a change in the structure of life and society.

Majnu has made a successful attempt to clash with the cruel and oppressive forces of the times by using the Romantic imagination. With the help of sentimentality and intuition, he introduced the reader to such a delusional universe that had nothing to do with our world. In the beautiful valley of this imaginary place, the restless mind gets peace, and by immersing itself in its splendor and beauty, it closes its eyes from the disturbing environment.

اردو ادب پر مغربی ادب کا زیر بار احسان ہے کہ اس میں صنف افسانہ نگاری کا جھلملاتا ستارہ نمودگی کے ساتھ داخل ہوا، اور اردو ادب کا یہ نمایاں وصف ہے کہ اس میں داخل ہونے والے اس ستارے کو اپنی روشنی عطا کر کے اور بھی زیادہ چمکدار بنا دیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اردو افسانے نے جنم لیا، اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اور بہت جلد اپنے آپ میں ایک مستحکم صورت اختیار کر لیا۔

جب اردو افسانہ نگاری اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے ادبی منظر نامے پر ادب لطیف یعنی رومانیت کا رجحان بہت ہی گہرا تھا۔ رومانیت کے لطیف جذبات کا اثر براہِ راست اردو افسانے پر دیکھنے کو ملا۔ رومانی میلانات کے اہم افسانہ نگاروں میں مجنوں گورکھپوری کا نام سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے مستحق ہے۔ وہ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے انگریزی ادب کو اپنے دامن میں سمیٹے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر انکے افکار و نظریات کو مشرقی فضا میں داخل کرانے میں اپنا ایک الگ مقام حاصل کیا۔ ان کا شمار نہ صرف ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کا نام بحیثیت نقاد بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ تنقید کی پُر خار وادی میں ان کی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔

مجنوں گورکھپوری کا اصل نام احمد صدیقی تھا۔ انکی ولادت جنوری ۱۹۰۴ء میں بمقام ضلع بستی کے گاؤں منجریا میں ہوئی انکے والد کا اسم گرامی مولوی محمد فاروق دیوانہ تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کیلئے گورکھپور گئے جہاں انکا ننھال بھی تھا۔ مجنوں صاحب کا مطالعہ بہت ہی وسیع تھا جس کا اعتراف انہوں نے اپنے افسانوی مجموعہ ''سمن پوش'' کے مقدمے میں ''نگاہ بازگشت'' کے عنوان میں کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

''مطالعہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اور میرے لئے افیون کی قسم کی چیز رہی ہے۔ بہت کم ایسے مسائل اور مباحث ہوں گے جن کا میں نے کم سے کم کتابی مطالعہ نہ کیا ہو اور دنیا کے بہت کم مصنف ایسے ہوں گے جن سے میں نے کچھ نہ کچھ بصیرت نہ حاصل کی ہو۔'' (مجموعہ سمن پوش۔ص۔۹)

پروفیسر احتشام حسین کہتے ہیں۔

''ان کا ادب کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ اور وسیع فلسفیانہ نقطہ نظر رکھنے کے باعث ادب کے بارے میں انکی باتیں کبھی معمولی اور فکر سے خالی نہیں ہوتیں۔''

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ احتشام حسین ص۔۳۲۱)

مجنوں گورکھپوری انگریزی افسانہ نگار ہاڑڈی سے بہت متاثر تھے۔ ہارڈی کے افسانوں کی فضا انکے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کہنا ہے:

''مجنوں پر ہارڈی کا اثر سب سے زیادہ غالب ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ھارڈی کے فن کے چراغ سے انہوں نے اپنے فن کا چراغ

روشن کیا۔ چنانچہ ان کے یہاں ہارڈی کی قنوطیت بھی ہے''
(افسانہ اور افسانے کی تنقید از ڈاکٹر عبادت بریلوی ص۔ ۱۱۰۔۱۰۹)

ٹامس ھارڈی سے متاثر ہونا مجنوںؔ کے لئے محض مطالعے کی بنیاد پر نہ تھا۔ بلکہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے اکسانے کا نتیجہ تھا۔ اس حوالے سے مجنوںؔ صاحب نے ''ارمغانِ مجنوں'' کے جلد اول میں اپنا بیان پیش کیا ہے جو بزبانی صغیر افراھیم درجہ ذیل ہیں:

''۱۹۲۵ء میں گرمیوں کی ایک رات میں، پریم چند اور فراق اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ فراقؔ نے ایک افسانہ کا مبہم خاکہ بنا کر کہا کہ تم دونوں اس قسم کا افسانہ لکھو۔ افسانے کی بنیاد ٹامس ھارڈی کے مشہور ناول 'ٹیس' کے مبہم تاثرات پر تھی۔''
(اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل از ڈاکٹر صغیر افراھیم ص۔ ۱۳۴)

گویا! مجنوںؔ نے فراقؔ صاحب کے تحریک کے بنا پر اسی خاکہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک کامیاب افسانہ ''گہنا'' تحریر کیا۔ جو ماہنامہ 'نگار' میں جون ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ افسانے کے مرکزی کردار رادھاؔ نام کی ایک عورت ہے جو ایک گوالے کی لڑکی ہے اور رام لالؔ کی بیوی کے روپ میں درسایا گیا ہے۔ رادھاؔ ایک بہت خوبصورت اور حسن پیکر لڑکی تھی۔ لیکن شروع میں اسے اپنی خوبصورتی کا احساس نہ تھا۔ اور جب شادی کے بعد اسے اپنے حسن و شباب کا احساس ہوتا ہے تو زیورات سے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن رام لالؔ اپنی مفلسی اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے رادھاؔ کو سمجھانے کی سعی کرتا ہے کہ

''ایشور نے تم کو ایسی پونجی دی ہے جو ہر آدمی کو نصیب نہیں ہوتی۔ تمہارا یہ پھول

سا رنگ و روپ گہنوں کا محتاج نہیں ۔تم اس کے لئے اپنا جی نہ کڑھاؤ۔۔۔۔۔۔۔"

(بحوالہ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل از ڈاکٹر صغیر افراھیم ص۔ ۱۳۴)

مگر وقت کے ساتھ ساتھ رادھا کو گہنوں سے محبت بڑھتی جارہی تھی۔اور آخر میں رام لالؔ پنی بیوی کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کلکتہ شہر کا رخ کرتا ہے اور اپنی بیوی کو تاکید کرتا ہے کہ چار سال تک وہ اسکا انتظار کرے جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجائے گھر واپس نہیں آئے گا۔اس کے بعد چار سال گذر جاتا ہے پر رام لالؔ کی واپسی نہیں ہوتی اور اسی دوران رادھاؔ ایک تعلیم یافتہ اور دولت مند شخص ہریش چندرؔ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اور دونوں سماج کی مخالفت کے باوجود ازدواجی زندگی میں جُڑ جاتے ہیں ۔اچانک رام لالؔ واپس آجاتا ہے اور رادھاؔ کو ہریش چندر کے ساتھ دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے اور پھر اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ ہریش چندر بہت ہی حساس قسم کا انسان ہوتا ہے۔وہ یہ کیفیت دیکھ کر خود کو رام لالؔ کا قاتل سمجھنے لگتا ہے۔اور جرمانے کے طور پر اپنی ساری دولت اور رادھاؔ کو چھوڑ کر رام لال کی کٹیا میں جابستا ہے اور اسی دردانگیز المیہ کے ساتھ افسانہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اور مجنوں صاحب کا حساس ذہن ابھر کر سامنے آتا ہے۔

یہ افسانہ ہارڈی کے گہرے اثرات سے مستعار ہے۔افسانوں میں پائی جانے والی تمام تکنیکی پہلوؤں کا استعمال انہوں نے انگریزی افسانوں کی تکنیک سے سنجیدہ طور پر اخذ کیا اور اسے کامیاب تجربے کے ساتھ اردو ادب کے افسانوی کائنات میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ انکے اور دوسرے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانوں کی فضا رنج والم کے جذبات سے بھی مملو ہے۔ہلکی ہلکی رومانیت، المناک مناظر،

نفسیاتی الجھن ،قنوطیت ،تلخی وتیکھا پن ، امن وسکون مجبوری غرض! ان سب عناصر کی مدد و تعاون سے وہ ایک خاص قسم کے اسلوب کی تعمیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوی مجموعہ ''سمن پوش''میں گریز کے عنوان میں رقم طراز ہیں:

''میں کبھی اپنے افسانے میں قصد واہتمام کے ساتھ کوئی نکتہ یا عقدہ نہیں پیش کرتا لیکن زندگی کے تلخ حقیقتوں کونظر کے سامنے ضرور رکھتا ہوں اور مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے۔ چنانچہ میرے بیشتر افسانے محبت کے افسانے ہیں۔''
(سمن پوش اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری ص۔ ۲۲)

ڈاکٹر اعجاز حسین رقم طراز ہیں:

''ان کا ہر افسانہ محبت کے جذبات سے لبریز ہے۔بعض اوقات محبت کی شدت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کے افسانوں محبت کرنے والا کسی اور کا کام نہیں رہتا۔ وہ محبت کے لطیف سے لطیف جذبے کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔عورت خاموش محبت کرتی ہے اور یہاں تک کہ ضبط سے کام لیتی ہیکہ اسکا انجام دیکھا نہیں جاتا۔مجنوں کے قصوں کا خاتمہ عموماً المیہ ہے۔ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ تیکھا پن اور وہ تلخی جو روح شکن ہو رہی تھی۔کم ہو جائے لیکن پھر بھی وہ ہر نرمی اور گھلاوٹ نہیں آنے پاتی۔جس سے اس قدر شدید قنوطیت کی تلافی ہو سکے۔''
(مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر اعجاز حسین۔س۔ ۲۶۰)

لہذا ! محبت مجنوںؔ صاحب کا خاص اور دلچسپ موضوع ہے ۔اسی لئے انکی کہانیاں عشق ومحبت کے جذبات سے سرشار ومعمور ہوتی ہیں۔پچھلے صفحات پر افسانہ ''گہنا''

کا ذکر آیا ہے، کس طرح رام لال اپنی رادھا کی محبت کے لئے اسکی خواہشات کو پورا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اور اسی محبت کی شدت میں خود کو ہلاک کر دیتا ہے جو ایک المیہ ہے۔ اسی طرح انکا ایک شاہکار افسانہ ''خواب وخیال'' ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے محبت کے لطیف جذبات کے سہارے اپنے فکر کی بلندی اور فن کی پختگی کا احساس دلایا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار نسیم نام کا ایک شخص جو زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہوتا ہے۔ اسکی زندگی تاریک کے پس پردہ میں گم ہے۔ اور اسکی زندگی میں ایک خلاء سی چھائی ہوئی ہے۔ اس خلاء کو پُر کرنے اور اسکی زندگی کو روشن اور تابناک بنانے کی غرض سے افسانے کی ہیروئین ریحانہ کی انٹری (entry) ہوتی ہے۔ اور اس کے حواسِ خمسہ کو عشق کے ذائقے سے آشنا کراتی ہے۔ اور جب نسیم اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو ریحانہ کا رشتہ کسی دوسری جگہ منسوب ہوجاتا ہے اور اسوقت وہ نسیم کو کہتی ہے:

''میں تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ صرف اسلئے کیا کہ تمہارے اندر ایک رگ بیکار پوری سو رہی تھی۔ میں نے اس کو بیدار کر دیا۔ اب میں دوسرے کی ہونے والی ہوں۔ تم بھی کسی دوسرے کے ہو رہو۔''

(خواب وخیال اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری ص۔۴۱۔۴۰)

ریحانہ کی ان باتوں کو سن کر نسیم ناامیدی کے شکنجے میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اور پہلے والی زیست کی آمجگاہ بن جاتا ہے۔ اسی دوران اتفاق سے نسیم کی ملاقات ثریا نام کی ایک دو شیزہ سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ثریا نسیم کی خستہ حالی پر گرفت پالیتی ہے۔ اور اسے احساس دلاتی ہے کہ ''محبت ایک لطیف اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ جس کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی سروکار نہیں۔''

(خواب وخیال اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری۔ص۔۴۹)

فلسفہ محبت پر مجنوں صاحب کا اسطرح کا بیان قاری کو عشق و رومان کی دنیا کا سیر کراتا ہے۔ اور ایک حسین جذبے کی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ رومانیت کے تعلق سے مجنوں صاحب کا گہرا مشاہدہ یہ بات تسلیم کرانے پر زور دیتا ہے کہ بنیادی طور پر انکا تعلق رومانی دبستان سے رہا ہے۔ جس کا اقرار و اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میرے افسانے رومانی مدرسے کی چیزیں ہیں۔''
(سمن پوش اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری ص۔۔۔۷)

محبت کے علاوہ مجنوںؔ کے افسانوں میں ادب، فلسفہ، جمالیات، اور نفسیات کے چلمن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان چلمنوں میں سے عشق و رومان کی عشوہ کاریاں ہی جھلکتی ہیں ۔ مجنوں صاحب ایک انقلاب پسند ذہنیت کے مالک تھے۔ وہ زندگی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ فلسفہ محبت کو ہی دیکھا جائے تو ان کے نزدیک عشق و محبت کے بارے میں ان کا یہ بیان ملتا ہے۔

''عشق تو دراصل وہ چیز ہے جو انسان کو ملائکہ سے بھی زیادہ برگزیدہ بنا سکتی ہے، اس سے انسان کی ہستی جلا پاتی ہے۔ لیکن انسان نے بھی اپنے کو کیسا آلودہ بنا ڈالا ہے۔ لوگ جب بھی محبت کا ذکر کرتے ہیں تو میں چڑھ اس لئے جاتا ہوں کہ وہ خوہ مخواہ ایک گوشت پوست کے ہیجان کو محبت کہتے۔''
(خواب و خیال اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری افسانہ شکست بے صدا ص۔ ۱۶۲)

مذکورہ اقتباس بے شک ایک انقلاب پسند ذہنیت کی پیداوار ہے۔ صرف جسمانی پیاس ہی محبت کی پیاس کو نہیں بجھاتی ہے بلکہ اس کے لئے روحانی میلان بھی اشد ضروری ہوتا ہے۔ مجنوں کے چند افسانوں کا موضوع اوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال کردار کی

شمولیت بھی ہے جو پہلی بار اردو افسانہ کو فلسفیانہ زندگی سے روبرو کراتا ہے۔لیکن کہیں کہیں کچھ ایسے کردار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو طویل فلسفیانہ، منطقیانہ، نفسیاتی الجھنوں اور علمی بحثوں میں گم ہو کر افسانے کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔اگر چہ وہ تجسس اور اشتیاق کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ طلسمی موتی پرو جانے کے باوجود جلد ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک افسانہ ''محبت کی قربانیاں'' کا اقتباس ملاحظہ ہو جس کی فلسفیانہ اور منطقیانہ تقریر افسانے میں بوجھل کا احساس دلاتی ہے۔جیل جاتے وقت افسانے کا ہیرو اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے۔

''میں چلا لیکن تم لوگ ہو۔یہ حریت اور غلامی کی جنگ، یہ فاقہ کشی اور شکم سپری کی لڑائی رکنے نہ پائے۔جب تک تمہارے جسم میں ایک قطرہ لہو بھی باقی ہے۔ اسوقت تک پیچھے نہ ہٹو۔تمہاری زندگی یہی ہے۔تمہاری نجات اسی میں ہے۔''
(خواب وخیال اور دوسرے افسانے از مجنوں گورکھپوری افسانہ محبت کی قربانیاں ص۔۲۰۷)

اسطرح مجنوں گورکھپوری رومانیت کے شانہ بشانہ چل کر فن افسانہ نگاری کے ذریعہ تخیل کے مزاج کو بروئے کار لاتے ہوئے زمانے کے ظالم اور جابر مزاج سے ٹکرانے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ جذباتیت اور وجدانیت کے سہارے قاری کو ایک ایسی دلفریب کائنات سے متعارف کرایا جس کا دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔اس تصوراتی جہاں کی خوبصورت وادی میں بے چین ذہن عافیت محسوس کرنے لگی اور اس کی دلکشی اور رعنائیوں میں کھو کر پریشان کن ماحول سے آنکھیں موند لیں۔

علامہ سیماب ؔ "لوح محفوظ" کے آئینے میں

ڈاکٹر رضا مظہر انصاری
سابق گیسٹ ٹیچر، شعبۂ اردو
گورنمنٹ گرلس جنرل ڈگری کالج، کولکاتا

Abstract:

Seemab Akbarabadi is counted among those lucky poets who have not been forgotten with the passage of time. He is counted among the poets of the early twentieth century who gained popularity by having a successful and healthy experience in different genres of poetry/ speech with intellectual and technical commitment. He started writing poetry during his school days. In 1921, he founded an institution "Qasr-ul-Adab" to train new poets. Many of his poetry collections are written in secret, both general and special, and now this collection will provide the readers with mental refreshment. His Poetry Collection "LOH-E-MAHFOOZ" was published from Mumbai in 1979. His unpublished ghazals which were written between 1943 and 1950 have been included in the collection under review. In the ghazals of Loh-e-Mahfooz, maturity, modesty and elegance are found along with experience in language and techniques. On the one hand, the partition of India is reflected in them, on the other hand, there are many poems on the sufferings of migration, political changes, but one feature is very clear that most of the ghazals of this collection are

towards the extreme goals of divine knowledge. In these ghazals, elderly and sympathetic attitudes are also found in some places. Despite all this, he still has his own distinctive tone, fluidity and freshness.

سیمابؔ اکبر آبادی کا شمار اردو کے ان خوش نصیب شعراء میں ہوتا ہے جنہیں گزرتے وقت کے ساتھ ادب کے معماروں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ سیمابؔ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے۔ ان کی زندگی سراپا علم تھی اور ان کا ہر سانس شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ جہاں وہ فصیح الملک مرزا داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے وہیں اپنی خداداد صلاحیت کے سبب ساغرؔ نظامی جیسے باکمال شاعر بھی اردو ادب میں پیدا کئے ہیں۔ ان کے دم قدم سے اردو ادب کے ذوق کا اتنا زبردست احیاء ہوا کہ اس برصغیر کا بمشکل کوئی ایسا گوشہ ہوگا جہاں ان کے شاگرد موجود نہ تھے۔ بلا شبہ سیمابؔ کی شخصیت اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور اردو شاعری میں نئے اقدارِ حیات کو داخل کرنے اور جدید رجحاناتِ شعری کو اصل منزل کی طرف موڑنے کی شعوری جدوجہد میں ان کی کوششیں ہمیشہ مشکور رہیں گی۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، سلام، نوحہ، نعت اور منقبت وغیرہ میں فکری و فنی التزامات کے ساتھ کامیاب اور صحت مند تجربہ کر کے شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کا خود کا کہنا بالکل درست ہے کہ:

میخانہ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

خیر مجھے یہاں ان کے تمام اصناف سخن سے بحث نہیں کرنی بلکہ اپنے موضوع کے پیش نظر ان کی غزلوں کے دو اوین میں سے صرف اور صرف "لوح محفوظ" کی غزلیہ شاعری کو احاطہ

تحریر میں لانا مقصود ہے۔

لوح محفوظ" سیمابؔ اکبرآبادی کی غزلیہ شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے جس کی اشاعت اول 1979ء میں سیماب اکاڈمی (بمبئی) سے ہوئی۔ اس مجموعہ میں سیمابؔ کی وہ غیر مطبوعہ غزلوں کا انتخاب شامل ہے جسے اعجاز صدیقی مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ اس مجموعہ کو بعد میں بالترتیب نومبر 1983ء میں مظہر حسین صدیقی نے سیماب اکاڈمی (کراچی) سے اور فروری 1994ء میں حیدرآباد کے حسامی بک ڈپو نے آندھرا پردیش سے شائع کیا۔ 1943ء سے لیکر 1951ء تک کی کہی ہوئی 105 غزلیں اس مجموعہ کی زینت ہیں مگر اس میں شامل کردہ غزلیں کب، کہاں اور کس طرحی مشاعروں کی یادگار ہیں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ جب بات "لوح محفوظ" کی ہو تو زبان پر برجستہ ان کا ایک شعر آجاتا ہے جو کہ عام طور پر ان کی شاعری کا طرہ امتیاز کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

میں کہ پیغمبرِ تہذیبِ سخن تھا سیمابؔ
سلسلہ شعرِ مہذب کا مرے گھر سے چلا

اس شعر کی حقیقت کوئی غلو یا شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ایک صداقت آمیز سلسلہ شاعری ہے، جہاں اردو ادب کی آن، بان اور شان کی خاطر گھرانہ سیمابؔ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ البتہ یہاں یہ بھی کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ سیمابؔ کا آخری مجموعہ کلام یعنی "لوح محفوظ" کی تمام غزلیہ شاعری فلسفہ حیات اور حقائق زندگی کی نکتہ رسی سے شرابور ہے مثلاً:

نگاہِ ابر میں پھول اور کانٹے سب برابر ہیں
محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست و دشمن کو

البتہ محبت ایک ایسا مرض ہے جس میں تقریباً ہر شخص گرفتار ہوتا ہے۔اس لئے میدانِ عشق میں وصال، ہجر، مایوسی اور مدہوشی وغیرہ جیسی کچھ چیزیں ایسی بھی ملتی ہیں جن سے سبھی وابستہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔مگر ایک سچا عاشق اپنے آپ کو اس وقت انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہے جب اس کی معشوقہ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے اپنے عاشق کا ہی قسم کھائے۔اب ظاہر ہے کہ انسان قسم اسی کی کھاتا ہے جس سے وہ بہت خلوص یا الفت رکھتا ہو۔چنانچہ جب عاشق کے کانوں سے اس کے نام کی قسم ٹکراتی ہے تو وہ پل بھر کے لئے خود کو عرش بریں پر محسوس کرنے لگتا ہے اور جوش وجنون میں ان کے زبان سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ:

قسم اب وہ کھانے لگے ہیں ہماری
بڑی چیز نامِ خدا ہو گئے ہم

یہ تو ایک عاشق کی جیت اور مثبت پہلو تھا اور اب اس عشق کا منفی پہلو بھی دیکھئے۔مگر سیماب کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ منفی باتوں اور خیالوں سے بھی مثبت کا پہلو اجگر کر دیتے ہیں۔آپ اس بات کو اس طرح سمجھیں کہ عاشق کو عشق میں قربت کے مواقع کم اور ہجر کی تنہائیاں زیادہ میئسر آتی ہیں۔مگر ایسے حالات میں بھی عاشق کی جیت ہوتی ہے کیونکہ عاشق کے تصورات میں صرف اور صرف اس کی معشوق کا ہی دخل ہوتا ہے اور غائبانہ طور پر ہی سہی مگر اس وقت آپس میں ہی کبھی راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں تو کبھی ناز پر نیاز کے سجدوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔عام خیال کے مطابق اس عاشق کے تنہائی کا آخری وقت عالم نزع کے مانند گزرنا چاہئے مگر سیماب کیا کہتے ہیں:

محبت عقل کے بس کی نہیں راہِ جنوں پر چل
کہ رہرو سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو

اے تن آسانی ہمارا دامنِ ہمت نہ کھینچ
مشکلوں کی حد تک آئے ہیں بڑے مشکل سے ہم

ان اشعار کے نزاکتِ خیال کا کیا کہنا کہ اس تخیلات اور صداقت کی لطف اندوزی وہی محسوس کرسکتا ہے جو عشق کی معراج سے پورے طور پر آشنا ہو۔ سیمابؔ کے مذکورہ متوسط شعر میں محبت کی کامرانی کا ضامن عقل کی جگہ جنون کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ رہزن کو ہی رہرو سے زیادہ تر محبت میں کامیابی و کامرانی کی آگہی ملتی رہتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو عقل پر جنون کو فوقیت دیکر اس شعر میں رسمی شاعری سے ہٹ کر ایک نئی اور انوکھی بات کہنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح موخرالذکر شعر میں بھی لفظ "مشکل" کو دو مختلف انداز سے استعمال کرنا ہی شعر کو زمین سے آسمان تک پہونچانے کے مانند ہے۔ دراصل یہ ان کی قادرالکلامی اور فنی کمالات کا جوہر خاص ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں حسن و عشق کی معاملہ بندی نہایت ہی پاکیزہ لب ولہجہ میں رقم کی گئی ہے وہیں تصوف کے اسرار و رموز کی موشگافیاں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متقی اور پرہیزگار انسانوں کے لئے مالک کائنات ان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے اور اس بات کا ادراک وہی کرسکتا ہے جو واقعی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والا سچا مسلمان ہو۔ چونکہ سیمابؔ بہ شرفِ بیعت "وارثی" تھے اس لحاظ سے ان کے یہاں وہ سارے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے جو ایک کامل اور فاضل مسلمان میں ہونی چاہئے۔ اس لحاظ سے "لوح محفوظ" کی تمام غزلیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا مطالعہ اسلامی تصوف کتنا باریک بیں اور فکر و تدبر کا حامل ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر مذکورہ مجموعہ سے تصوف آمیز چند اشعار دیکھئے:

اٹھتا ہوں جب چمن میں نماز سحر کو میں
سجدے میں دیکھتا ہوں ہر اک برگ و بر کو میں
وہ سجدہ کیا رہے احساس جس میں سر اٹھانے کا
عبادت اور بقید ہوش توہین عبادت ہے
ناز ادھر نیاز ادھر کتنا غلط نظام ہے
حسن نہیں عنیم ہے عشق نہیں غلام ہے

سیمابؔ کا نام معمار شعر و ادب میں یوں ہی سرفہرست نہیں بلکہ سیدھی سی بات ہے کہ ان کا ہر شعر شائستہ آفریں، ہر موضوع بے مثل اور ہر خیال بے نظیر ہے۔ جیسا ان کا نام ویسا ہی ان کا کام۔ اب ان کا یہ شعر بھی دیکھیں جس میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ سچا اور نیک مسلمان بظاہر مرتا ہے مگر اس کی روح اور ان کا نام ان کے نیک کارناموں کے سبب ہمیشہ زندہ و جاوید رہتی ہے۔ سیمابؔ اسی خیال کو اپنے اوپر اطلاق کرتے ہوئے بجا طور پر فرماتے ہیں:

مجھے خدشۂ مرگ سیمابؔ کیسا
ملی عمر و خضر و حیات مسیحا

یہاں ان کے معنی خیز، اثر انگیز اور تغزل سے لبریز چند اور اشعار ملاحظہ کریں جو نہایت متین اور حسین خیال کی پیروی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور جس کی مثال اردو شعری ادب میں کمیاب ہے:

دماغ و روح یکساں چاہئے انسانِ کامل میں
یہ کیا تقسیم ناقص ہے خودی شہر میں خدا دل میں

بے دلی موت نہیں موت سے بھی بدتر ہے
جان لے لے مری محروم نہ کر دل سے مجھے

اب یہاں "لوح محفوظ" کی ضرورت و قیمت، اس کی اہمیت و افادیت اور اس کی اثر انگیزی و گہرائی کے باب میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی آرا ملاحظہ کریں جسے انہوں نے مذکورہ مجموعہ کلام میں تحریر فرمایا ہے۔ اس بیان سے مذکورہ دیوان کے نکات و محاکات واضح طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آئیں گے اور جس کی روشنی میں اس مجموعہ کی نظر ثانی اپنے صحیح Dimension کو پہونچ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شاعر اپنی دور بین نظروں سے آنے والے زمانے کے متعلق پیشن گوئی کر رہا ہے، مغرب زدہ معاشرہ اپنی جڑیں پکڑ رہا ہے اور اس نے چونکہ روایت اور اپنی مذہبی اقتدار سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ قوم اور ملت کو جدیدیت کے قریب لا رہا ہے اور خود بھی جدید ذہن سے کام لے رہا ہے۔ روایت سے رشتہ توڑنا اسے پسند نہیں مگر روایت کے استحکام ہی کی خاطر ایک نئے اندازِ احساس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور قوم کو نئی راہوں اور نئی منزلوں کے نشانات دکھا کر ان کے مفاسد سے بچنے اور ان کے محاسن سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ اور وہ یوں ہے کہ:

ضرورت سوزِ نو کی ہے مرے ذوقِ تپیدن کو
ذرا پھر طور سے آواز دینا برقِ ایمن کو

("لوح محفوظ"۔ مشولہ مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ۔ اسلامی بک ڈپو، حیدر آباد۔ 1994۔ صفحہ 16۔17) بالآخر انہوں نے اس مجموعہ کا احاطہ کرتے ہوئے اپنی بات کو سیمابؔ کے ایک شعر پر ختم کیا ہے:

میں کسی سے دنیا میں آشنا نہیں سیمابؔ
خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے

''لوحِ محفوظ'' کی متعدد غزلیں اس وقت پروان چڑھیں جب ہندوستان بھر میں ترقی پسند تحریک کا عمل اپنے عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب میں حقیقت پسندی کو ایک تحریک کی شکل ملی۔ یہی وہ دور تھا جب ملک بھر کے شاعروں اور ادیبوں نے ادب برائے ادب کے نظریہ سے انحراف کرتے ہوئے ادب برائے زندگی کے تصورات کو شعروادب میں شامل کیا۔ اس تبدیلی کی ضرورت کئی دانشورانِ ادب اور محافظانِ ملک بہت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ ملک تو ملک یہاں کے ادب اور عوام بھی رسمی پابندی اور آپسی نفاقی کے لحاظ سے پورے طور پر مفلوج ہو چکا تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس مہلک اور موذی بیماری سے ملک، ادب اور عوام کو کیسے نجات دلایا جائے۔ حالانکہ سیمابؔ اس بات کا ادراک بہت پہلے ہی اپنے ذہنِ رسا اور دلِ بیدار سے کر چکے تھے جو بعد میں ترقی پسند تحریک کا منشور معلوم ہوتی ہے۔ اس پر آشوب دور کے منظر نامے کے سبب جو ترقی پسند شاعری میں علامتوں اور تراکیبوں کا خاصا بنی اسے سیمابؔ نے بہت پہلے سے ہی برتنا شروع کر دیا تھا۔ مگر افسوس اس بات کی ہے کہ ان کی پیشن گوئی پر ادب نوازوں نے کان نہیں دھری۔ بہر کیف! یہاں ان کی پہلی غزل کا مطلع اور مقطع کے ساتھ چند اشعار اور درج کئے جا رہیں جس سے ان کے عصر کا تخلیقی ذہن کارفرما ہوتا نظر آتا ہے:

کسی نے بھی حفاظت سے نہ رکھا میرے چلمن کو
خزاں ہشیار ہی کرتی رہی یارانِ گلشن کو
نہیں ایسا معمہ کوئی جس کا حل نہیں ممکن
سنبھلنا چاہئے سیمابؔ میرے دل کی الجھن کو

فنا کے ہاتھ سے جاں آدمی بچا نہ سکا
غریب بچ کے بہت مرگِ ناگہاں سے چلا
اگر نہ میرے سر اور تیرے آستاں سے چلا
بتا کہ سجدوں کا دستور پھر کہاں سے چلا

اس مجموعے میں ان کے ایسے ایسے احتجاجی اشعار شامل ہیں کہ وطن پرست انسانوں کو خواب بیداری سے جگانے اور آزادی وطن کے لئے کوشاں کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ اشعار اس پر آشوب دور کی عکاس ہیں جب کہ فرنگی محکومیت سے سارے ہندوستانی بیزار ہو گئے تھے اور ان کی عیاری اور مکاری سے نبرد آزما ہونے کے لئے خود کے دل میں آگ الاپ رہے تھے۔ وہ اپنے ملک اور ہم وطنوں کی خاطر احتجاج کے سر کچھ اس انداز سے پھونکتے ہیں:

میں زنداں میں ہوں منظر ہے تصور میں گلستاں کا
کوئی ہے روکنے والا مری فکرِ خراماں کا

البتہ اب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی زبانی "لوح محفوظ" کے تئیں غزلوں کے چند اشعار اور اقتباس سنیں جس سے سیمابؔ کی غزلیہ شاعری کے پوشیدہ نکات اجاگر ہوتے ہیں:

''سیمابؔ صاحب کے اس مجموعے کے یہ چند اشعار دیکھئے، آپ ہی کے درد کا پتہ دیتے ہیں:

یہ رسمی انقلابِ وقت تکلیفِ نظر کیوں ہو
قفس میں شام ہو جائے تو ہو جائے سحر کیوں ہو

گریبانِ گل و دامانِ لالہ بھی ہے گلشن میں
مجھ ہی پر التفاتِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو
اسیری اور ایسی بے بسی اللہ رے مجبوری
کسی نے یہ نہ پوچھا آج تم بے بال پر کیوں ہو

.....

تم جو چھوڑ آئے تھے وہ رنگ بھی باقی نہ رہا
تم سے یارانِ قفس ذکرِ چمن کیا کرتے

اشعار رقم کرنے کے بعد مذکورہ مجموعہ کلام پر اپنی رائے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ چند اشعار میں نے صرف اس مجموعے کی ورق گردانی سے اخذ کر لئے ہیں۔ ورنہ ایسی بہت سی مثالیں اس میں موجود ہیں۔ ان میں ایک طرف عصر حاضر کا شعور ہے اور ایک طرف وہ احساس جو ان حالات و واقعات کو جذبے کی صورت دیتا اور الفاظ کی تشکیل کرتا ہے۔ سیمابؔ صاحب کو ان دونوں پہلوؤں پر قدرت حاصل ہے... اس مختصر تعارف کو میں سیمابؔ صاحب کی اس غزل پر ختم کرتا ہوں اور آپ کو اس مجموعے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔

وطن کے بعد ارباب وطن کی آزمائش ہے
چمن سے دور یارانِ چمن کی آزمائش ہے
بڑا فکر آزما یہ دور ہے سیمابؔ کیا کہئے
ہر اک میدان میں اہل سخن کی آزمائش ہے

(''لوح محفوظ''۔مشولہ مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ۔اسلامی بک ڈپو،حیدر آباد۔1994۔صفحہ 22۔24)

مگر میں نے یہاں اس غزل کا صرف مطلع اور مقطع ہی بطور مثال پیش کیا کیونکہ پوری غزل کی پیشکش شاید بے جا ہوگا۔

بہر کیف! دیگر مجموعہ کلام کی طرح ''لوح محفوظ'' کی غزلوں میں بھی جو شعری تراکیب، زبان و بیان اور استعارہ سازی وغیرہ کے جوہر ملتے ہیں اس سے سیمابؔ کے ادبی وشعری قد کمال عروج پر نظر آتا ہے۔ان کی غزلوں میں زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ تخیل کی گہرائی، فکر کی ندرت اور اجتہادی طرز ہر جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری کے جو ہر پارے میں ایک اور شگفتہ ترکیب قابل توجہ ہے کہ انہوں نے لفظ ''رومان'' کا استعمال اس حسین وجمیل انداز میں کیا ہے کہ آخر کار وہ لفظ اردو شعر وادب کا لازمی حصہ قرار پا گیا ہے۔یہاں تک کہ ترقی پسند شعراء نے اپنے منشور کے ساتھ لفظ ''رومان'' کو بھی اپنی شاعری کا جز خاص مانا اور پھر بعد میں یہ لفظ رواج پا کر ''رومانی'' کی شکل اختیار کر لی۔

واقعاتِ عشق کا تھا ایک ایک صدی لمحہ رومان
ہر نفس میں میں نے اک رومان پیدا کر دیا

ان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت دیکھیں جس میں بظاہر شعر کا ایک معنی نظر آتا ہو لیکن غور کرنے پر اس کی تہہ میں کئی معنی پوشیدہ نظر آتے ہیں جسے ہم ذو معنی شعر بھی کہہ سکتے ہیں۔مثلاً:

وہ کرے یاد انہیں جس نے بھلایا ہو کبھی
میں نے ان کو نہ بھلایا نہ کبھی یاد کیا

لگے ہاتھوں اب اس مجتہدِ ادب کی غزلیہ شاعری کے دو شعر قلمبند کر رہا ہوں جسے انہوں نے اپنی علالت کے وقت اپنے آخری ایام میں پیش کیا تھا۔ ان اشعار سے ان کی طبیعت نازکی اور ان کی بے بسی و مجبوری کا دلبرداشتہ اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ قانونِ فطرت کے سامنے تو تمام مخلوقات بے بس ہو ہی جاتے ہیں اور ان کے ساتھ بھی بالآخر یہی ہوا۔ ان کی کراچی منتقلی کے بعد بستر علالت کے وقت کے یہ اشعار دیکھیں جو ان کی اضطرابی اور مایوسی حقائق کو بیان کرتے ہیں:

رنگین تر اعذار ہے میری نظر سے دور
گلشن مع بہار ہے میری نظر سے دور
سیمابؔ جیسے باغ سے ہو دور فصل و گل
یوں چہرہ نگار ہے، میری نظر سے دور

الغرض سیمابؔ کی قادر الکلامی اور بے مثالی مجموعہ کلام یعنیٰ "لوح محفوظ" کے متعلق حامد اقبال صدیقی کے ایک قابل توجہ اظہارِ خیال ملاحظہ کریں:

''لوح محفوظ'' کی غزلوں میں پختگی، شائستگی اور سلیقگی کے ساتھ ساتھ زبان اور تراکیب کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ان میں ایک طرف تقسیم ہند کا غم جھلکتا ہے تو دوسری طرف ہجرت کا کرب، سیاسی تبدیلیوں پر متعدد اشعار ہیں، لیکن ایک خصوصیت بہت واضح ہے کہ اس مجموعے کی بیشتر غزلیں معرفت کی انتہائی منازل کی جانب شاعر کے سفر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کرنے کے بعد یقیناً وہ انکشاف کی منزلوں سے گزرے ہوں گے جو ان غزلوں میں عیاں ہے۔ کہیں کہیں بزرگانہ اور مشفقانہ رویے بھی پائے جاتے ہیں، ایک ستر برس کے بزرگ کے کلام میں ان رویوں کا موجود ہونا فطری

ہے۔ان سب کے باوجود ان کا اپنا مخصوص لہجہ، روانی اور تازگی پھر بھی موجود ہے۔'لوح محفوظ' حضرت سیمابؔ کے کمالِ غزل گوئی کے انتہائی عروج کا ثبوت ہے"۔

(سیماب اکبرآبادی۔حامد اقبال صدیقی۔ساہتیہ اکاڈمی، دہلی۔2009۔صفحہ 54)

چنانچہ"لوح محفوظ" کی تمام غزلیں ایک دانا اور باشعور ہستی کی تجرباتِ زندگی اور مشاہداتِ کائنات کا پرتو غزل کے پیکر میں اعلیٰ وارفع مقام متعین کرتی ہیں اور جس سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آخر کار غزل گو کا غزلیہ شاعری کس رتبے کا ہونا چاہئے۔انہوں نے ہمیشہ ایسی غزلوں کی مخالت اور اس سے پرہیز کیا جو عصری مسائل اور عصری تقاضوں سے لاتعلق ہو کر صرف تفریح طبع کے لئے کہی جاتی رہیں۔اس کے برعکس انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات کا بغور مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا اور انہیں ایک نئی رنگ و آہنگ کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا۔اسی لئے سیمابؔ کے آج سے کئی سال قبل کہے ہوئے اشعار موجودہ دور کے شاعرانہ مزاج کی نمائندگی کر رہی ہے اور ان کی شاعری ایک زندہ شاعری کی عمدہ مثال بھی ہے۔اس تعلق سے ان کے چند اشعار دیکھیں جو میرے بیان کو مزید پختگی عطا کرتی ہے۔بقول سیمابؔ:

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ رگِ جاں میں آ گئے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

شعر یوں کہتا ہے بے فکر و تکلف سیمابؔ
جیسے اس شخص کو الہام ہوا کرتا ہے

سیمابؔ میں جنت میں جب شعر بہ لب پہنچا
اکِ شور ہوا برپا ،مہمانِ سروش آیا

علامہ سیمابؔ واقعی ایک تلمیذالرحمٰن شاعر تھے۔ان کے یہاں میرؔ کی سی نازک مزاجی،نظیرؔ کی سی منظر نگاری اور غالبؔ کا سا شعری فن بھی موجود ہے۔اس طرح کے بہت سے ایسے منفرد خیالات اور بے مثال اشعار سیمابؔ کی غزلیہ شاعری میں پائے جاتے ہیں جو انقلابیت،وطن دوستی، ترک وطن کا کرب،وطن کی یاد،دوستوں کی رفاقت، حیات و کائنات کے اسرار و رموز، خدا کی قدرت اور اس کی کرشمہ سازیاں وغیرہ جیسے اہم موضوعات میں رومانیت و اشاریت کا حسین امتزاج پیدا کر دیتی ہے۔لہٰذا جیسے جیسے سیمابؔ کا شعور بالیدہ ہوتا گیا وہ عصری تقاضوں اور سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے مزید رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی خاص نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھرپور اشعار زندگی کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ پیش کیا۔اس پیشکش میں جہاں نئی ترکیبوں، اصطلاحوں،تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا وہیں اشارے کنائے، بامعنی محاورے اور علامتوں کا استعمال کر کے ایوان غزل میں ایک منفرد اور معتبر مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔بقول سیمابؔ:

سیمابؔ جلوہ تابِ زبان وادب ہوں میں
اردو کا ارتقا مرے رنگِ سخن میں ہے
میں ہوں اک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

العلامة فضل حق الخير آبادي: شخصية متعددة الجوانب

إعداد: د. شفيق الإسلام
الأستاذ المساعد بالكلية
الحكومية العامة للبكالوريوس للبنات، كولكاتا، الهند

Abstract:

Muhammad Fazle Haq Khairabadi better known as Allama Fazle Khairabadi was a versatile personality: he was a great Islamic scholar of his times, poet, writer and a philosopher as well as a revolutionary and a freedom-fighter who is resting in the soil of Andaman. In this article, I threw light upon the above-mentioned points.

في السطور التالية أود أن أقوم بدراسة حياة وأعمال شخص قلما جاد الزمان بمثله، ألا وهو فضل الحق الخير آبادي[١] أو محمد فضل الحق الخير آبادي[٢] . كانت شخصيته متعددة الجوانب: فكان شاعرا مجيدا، وعالما كبيرا، ومؤرخا وأحد فلاسفة العالم. وقد بلغت مساهمته في علم الفلسفة إلى حد أن المستشرق الشهير نلينو أشاد بدوره في تطوير علم الفلك في كتابه "علم الفلك وتاريخه عند العرب"[٣] .

أما نسبه، فهو فضل حق بن فضل إمام الخير آبادي العمري نسبة إلى أمير المؤمنين عمر بن الخطاب، حيث كان من سلالته[٤] . ولد فضل حق في قرية "خير آباد" بـ"أَيُودْهْيَا" في الهند سنة 1797م في بيت علم وفضل، حيث كان

أبوه فضل إمام أحد كبار العلماء في المنطق و الفلسفة في عصره. درس فضل حق جميع العلوم على والده ما عدا الحديث، فإنه قرأه على عبد القادر بن شاه ولي الله الدهلوي. حظي فضل حق بذكاء حاد و ذاكرة قوية، فقَدَرَ على حفظ القرآن الكريم في مدة أربعة أشهر فقط. تلقى جميع علوم عصره إلا انه نبغ في علمي المنطق و الفلسفة.

كان والده يعمل في ديوان الإنشاء في دهلي إبان حكومة الملك المغولي الأخير بَهادُرْ شاه ظفر، فمهدت وظيفته سبيل توظف ابنه فضل حق لاحقا. إلا أن فضل حق ثار مع الثائرين عندما اندلعت نار ثورة 1857م. ولكن هذه الثورة قدر لها أن تخفق لأسباب كثيرة من أهمها: إن هذه الثورة قامت بدون أي تشاور منظم بين عناصر مختلفة للمجتمع الهندي، ولم تكن توجد ذلك الحين أحزاب سياسية لها صلاحية لقيادة هذه الثورة، وإن الثورة أخفقت أيضا لوجود خلافات بين العناصر المختلفة للمجتمع[٥]. أما الخير آبادي فيرى أن من أهم الأسباب التي أدت إلى فشل الثورة هي:

- انغماس عدد من قواد الثورة في الملذات و انشغالهم في وسائل الترفيه و التسلية كما كانوا غير مجربين في مقاومة العدو.
- غدر الملوك الهندوس بالثائرين، حتى إن أحد هؤلاء الملوك قد أغار مع جيشه على الثائرين من ورائهم و كان الجيش الإنغليزي يهجم عليهم من الأمام.
- احتكرت جماعة من التجار الهندوس غلة مدينة دهلي

ووضعها في المستودعات، فضعف الثوار وماتوا جوعا.

- أُمِر الإقطاعيون الهندوس من قبل الإنغليز أن يقبضوا الثوار الهاربين ويرسلوهم إلى دهلي، ففعلوا. ثم ذبح الثائرون جماعيا.[٦]

وبعد إخفاق الثورة، أذاق الإنغليز الثائرين سوء العذاب، وذلك بإعدام بعض الثائرين وشنق بعضهم وسجن الآخرين. أما الخير آبادي فسجن وقضى بقية حياته في المنفى في جزيرة أندمان. سامه العدو الغاشم سوء العذاب و"وضعه في غرفة غير صحية. كان المطر يتقاطر من سقفها. وكان الماء يجتمع في هذه الغرفة الضيقة التي كانت مثل ضيق المراحيض. أعطي أعطي البنطلون والقميص القصيرين للبس. وللأكل كانت تقدم إليه ألوان من الأسماك المسلوقة ذات الرائحة الكريهة التي لا تصلح للأكل، وأحيانا أرغفة فيها الرمال. ومهما وجد من طعام، كان يخمد جوعه به. وكذلك يقدم إليه الماء السخين للشرب ولا يؤذن في تأجيل شربه ليبرد، حيث لو فعل ذلك لنزع منه الماء. وكان يجلد كل يوم. وكان عليه ان يسكن غرفة رطبة، وفي الليل في غرفة مظلمة. وفي معظم الأحيان، كانت العقارب تلدغه فكان يتململ... والأمر الأكثر أسفا أنه كان عليه أن ينظف برازه وبراز السجناء الآخرين كمنظف البراز. وكان هذا البطل السجين يقوم بذلك."[٧]

ولاحقا، ذهب ولداه عبد الحق وشمس الحق إلى إنكلترا وقدما الطلب لسراح أبيهما فقبل. فابتهج الهندوس والمسلمون سرورا آملين أن يروا بطلهم مرة ثانية. ويا للأسف! عندما وصلا إلى أندمان رأيا جنازة والدهما فبكيا كما بكى مئات الآلاف من الناس.

علمه وآثاره:

إن العلامة فضل حق الخير آبادي، بالإضافة إلى جهاده وتضحياته من أجل تحرير الهند من الاستعباد (أي: الاستعمار) البريطاني، صنف وألف، فأجاد وأفاد. ومن أهم ما أنتجت قريحته مايلي:

1. الجنس الغالي في شرح جواهر العالي
2. حاشية الأفق المبين
3. حاشية شرح السلم للقاضي محمد مبارك الكوفاموي
4. الهدية السعيدية في الحكمة
5. امتناع النظير
6. تحقيق الفتوى في إبدال الطغوى
7. الروض المجود في تحقيق حقيقة الوجود
8. رسالة في تحقيق العلم والمعلوم
9. رسالة في تحقيق التشكيك في الماهيات
10. الثورة الهندية وقصائد فتنة الهند[٨]

كان الخير آبادي ذا معارف واسعة وثقافة عالية ومحققا كبيرا. ومما يتضح به ذلك، قصته مع نائب السجان في أندمان وكان مستشرقا كبيرا ذا العطش الشديد للمعارف الشرقية. وكان لديه مخطوطة فارسية. وكان جاهلا باللغة الفارسية فلا يستطيع أن يقرأها. فبحث عن مترجم قدير فوجد في الخير آبادي بغيته، فطلب منه أن يترجمها. فأتم الترجمة مع الحواشي وإضافة الهوامش إليها بدون مراجعة الكتب المعزو إليها، برغم مرضه وحالته الذهنية

السيئة. فتعجب السجان من ذلك. فجاء لمقابلته فرآه يحمل أدوات التنظيف التي كان ينظف بها البراز. فتأسف السجان على ذلك، وعانقه بملابسه النظيفة والخير آبادي في ملابس قصيرة قذرة، واستماح منه العفو لتكليفه القيام بالعمل المخزي المذكور أعلاه وبكى فعفا عنه الخير آبادي وبكى هو أيضا.[٩]

قصيدة فتنة الثورة الهندية:

عندما اعتقل الخير آبادي وأرسل إلى أندمان، حمل معه كفنا. كان يسجل أفكاره التي تجول بخاطره في أواخر أيامه في هذا الكفن. وكان قد سأل السجانَ أن يرسل هذا الكفن إلى ابنيه ويكفن هو بكفن رسمي. وسمي ما كتب على هذا الكفن بعد بـ"قصيدة فتنة الثورة الهندية". وتحوي هذه القصيدة 186 بيتا. إنه ذكر فيها حوادث ثورة 1857، ونتائجها من القتل والشنق والنفي وما إلى ذلك من الاعتداءات التي قام بها الإنغليز على الهنود هندوسا ومسلمين. إنه يصف في قصيدته كل هذه الأشياء وصفا جميلا بارعا.

رسالة الثورة الهندية:

قد سرد المصنف في هذه الرسالة حوادث ثورة 1857م، بكل دقة وبراعة. فهي تعد مصدرا مهما من المصادر في ثورة 1857م. وكل ذلك بأسلوب بارع جميل؛ إلا أنه يغلب عليه السجع والبديع.

الرسالة السعيدية في الحكمة الطبيعية:

قد أهدى العلامة هذا الكتاب إلى محمد سعيد خان نَوَاب (والي) رام فور. هذا الكتاب نموذج رائع للكتب القيمة النافعة في علم الطبيعة، وهو مبني

على فلسفة أرسطاطاليس. يبتدئ الكتاب بتعريف وتقييم الحكمة. يرى الخير آبادي أن معنى الحكمة: علم حقائق الأشياء كما هي قدر ما يمكن الإنسان، والقيام بتلك الأعمال التي تمهد للإنسان طريقه إلى الكمال. وأولا تنقسم هذه الإشياء إلى قسمين: ما في أيدينا وما ليس في أيدينا. ومعرفة الأول تسمى "الحكمة العملية": وهي الأشياء التي في أيدينا، وهي أعمالنا. ثم تقسم هذه الحكمة العملية إلى ثلاثة أقسام أصغرَ: تهذيب الأخلاق، وتدبير المنزل والسياسة المدنية، لأن أفعال الإنسان إما أن تتعلق بفاعلها فقط، أو تتأثر بها أسرته، أو هي تعنى أعضاء مدينة أو دولة.

والأشياء التي ليست في أيدي الإنسان فمعرفتها تسمى "الحكمة النظرية" وتنقسم ثلاثة أقسام: العلم الإلهي، والعلم الرياضي والعلم الطبيعي. ثم ينقسم العلم الطبيعي إلى ثمانية أقسام فرعية، وهي:

1. علم السماء الطبيعي
2. علم السماء والعالم
3. علم الكون والفساد
4. علم الفعل والانفعال
5. علم الآثار العلوية
6. علم النفس
7. علم النبات
8. علم الحيَوان

إن كتاب الهدية السعيدية يحوي القسم الثالث للحكمة النظرية

وهي الحكمة الطبيعية مع جميع فروعها، كما يشتمل الكتاب على مقدمة وثلاثة أجزاء سميت "الفنون".[١٠]

وهذا الكتاب من أروع ما ألف في علم الطبيعة. قد بحث فيه المؤلف المكان، والحركة، والفلك، وكائنات الجو وأشياء أخرى بحثا دقيقا يدل على براعته في هذا العلم ونبوغه في علم الفلك، وقد استفاد في إعداد هذا الكتاب من الموارد التي تيسر له. إلا أن له آراء تعارض العلم الحديث، وخاصة رأيه في دوران الشمس أو الأرض.[١١]

شعره:

الخير آبادي، بالإضافة إلى كونه عالما كبيرا، كان شاعرا مجيدا أيضا. إنه قرض أكثر من أربعة آلاف بيت بلغة الضاد. وله ديوان شعر. ومعظم شعره في المدح والرثاء.

قال الخير آبادي يصف الاعتدائات التي قام بها الإنغليز على الهنود:

قد سلط الأنصار في أمصارنا أن صار أنصار لهم سفهاء
والآن إذ نصر النصارى أفرطوا في الظلم فاخترم الضعاف جفاء
غالوا رعاياهم غيلة فجرت كما انفجر العيون دماء
كم خربوا بلدا ولم يذر به بلدا فصار كأنه بيداء
هدموا المساجد والقصور كأنها لم تبن لم يك ثم قط بناء

ذا سيرنا الحثيث مع حياة العلامة محمد فضل حق الخير آبادي وتضحياته في سبيل تحرير الهند من براثن الاستعباد البريطاني، وآثاره، وإلمامه بالعلوم السائدة في عصره، ونبوغه في علم الحكمة ودوره في القريض. وكل

ذلك في اللغة العربية التي لم تكن لغته الأم.

الهوامش:

1۔ Murtaza Ghulam Ahmad, Cheperakha Itihas (The History Hushed Up), (Bengali), (Biswa Bangiya Prakashan, Kolkata, 1986, p.242

2۔ الزِرِكْلَى، خير الدين، الأعلام: قاموس تراجم لأشهر الرجال والنساء من العرب والمستعربين والمستشرقين، دار العلم للملايين، بيروت، لبنان، 1986، ج6، ص330

3۔ راجع: نلينو، علم الفلك: تاريخه عند العرب، روما، 1961

4۔ أنظر: الزركلي، مصدر سابق

5۔ أنظر للتفصيل:
Ghadar 1857 prepared by: Communist Party of India (Marxist), Delhi State Committe, 2007, pp. 40-44

6۔ Cheperakha Itihas, op. Cit. P. 244

7۔ Cheperakha Itihas, op. Cit. P. 244

8۔ محمد فضل حق الخير أبادي، الروض المجود، مطبع مفيد الإسلام، حيدر أباد، دكن، 1313هـ، ص58

9۔ Cheperakha Itihas, op. Cit. P. 242-243

10۔ Ahmad, M.G. Zubaid, The contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature, Kashmiri Bazar, Lahore, Pakistan, pp. 141-142

11۔ Ibid. pp. 142-148

الأستاذ المعصومي: شاعرا مجيدا

إعداد: محمد صدر الإسلام
الأستاذ المساعد بقسم اللغة العربية
مولانا آزاد، كولكاتا، الهند

Abstract:

Maulana Abu Mahfuzul Karim Masumi (1931-2009) is an accredited authority on Islamic studies in the post Independence era of India. His lifetime spanned to the services rendered to the cause of Arabic and Urdu literatures. It is an established fact that he was a poet of imminence and an iconic figure in the literary and cultural arena. His extra ordinary talent and in-depth knowledge of Indo-Arab philological sciences fetched him laudation and recognition from literary circles of India and abroad.

Though the poetry output in Arabic produced by Maulana Masumi is not bulk in size but it was quite impressive and got well acclamation in the literary sphere. He had a good flare in poetry which was shown and manifested at a very early age of nine.

Undoubtedly, he was a poet of high stature composing poetry with equal ease in Arabic, Persian and Urdu. The poetry of Maulana Masumi is traditional in language and highly conventional in structure. The themes of his Arabic poetry largely revolve around elegy, panegyric, lyrics, ode, description and greeting etc. The astonishing point which worthy to be mentioned here that he was born

and brought up in India. His educational journey never crossed the Indian subcontinent boarders yet his poetry exhibits a splendid command of the Arabic language exploring diversity of phrases and idioms. It is undeniable fact that his contributions to the Arabic poetry left indelible impression on the Indo-Arabic literary traditions in general and made some significant additions to the Indian chapter of Arabic poetry in particular.

إن الشيخ أبا محفوظ الكريم المعصومي يعد من أعلام الأدب العربي ومفاخره خلال القرن العشرين في شبه القارة الهندية. خلف ثروة أدبية ضخمة في اللغة العربية، أكثرها امتازت بالبحث والتحقيق فتناولتها طبقات الأمة العلمية والأدبية بالدراسة.

كان الشيخ المعصومي متعدد المواهب والتراكم المعرفي. فكان باحثا كبيرا وعالما نحريرا وشاعرا مجيدا. تفتحت مواهبه الشعرية في ريعان شبابه، فقد نظم قصيدة عربية سنة 1939م في مناسبة رؤية الهلال وهو لم يجاوز تسع سنوات من عمره. فيكتب الشاعر المعصومي:

"....سنح لي أن أنظم الشعر العربي لأول مرة في التاسعة من سنوات عمري. ولا أحفظ الآن إلا صدر البيت الأول وهو بنصه كما يلي:

طلع الهلال لنا برونق نوره

قلت ذلك بمناسبة هلال رمضان المبارك."

قرض المعصومي قصيدة رائعة سنة 1946م وهو طالب في المدرسة

العالية بكلكتا. أعجب بها شيخه الكبير مولانا المفتي السيد محمد عميم الإحسان المجددي حتى شاملها في كتابه الشهير "فقه السنن والآثار". فيكتب الشاعر المعصومي:

"...ومن بيض أيادي الشيخ على هذا العاجز أنه ضم إلى الطبعة قبل فهرست المراجع أبياتا سنحت للعاجز أوان الطلب تحت ظلاله الوارفة إلى سنة 1946م وكنت أهديتها على حضرته إذ ذاك (ص. 397-398) وجاءت المراجع في أربع صفحات بخط التعليق الدقيق"

إن الأستاذ المعصومي لم يلتفت إلى نظم الأشعار كثيرا بل إنه قرض القصائد والمراثي وغيرها في مناسبات الحزن والفرح والمسائية الشعرية والحفلات الثقافية وما إليها. هذا هو علة من العلل لِقِلّةِ انتاجه الشعري. في الحقيقة إنه لو اقتحم في قرض الأبيات والأشعار وانكب عليه لظهر فحلا من فحول الشعراء في شبه القارة الهندية.

إنه نظم الأبيات في اللغات الثلاث: العربية والفارسية والأردوية. تدور جل أشعاره حول الموضوعات الشائعة من الرثاء، والغزل، والوصف والرسالة الإخوانية، والترحيب والتهنئة وما إليها. كلها من بين مطبوعة وغير مطبوعة يبلغ عددها إلى خمس وثلاثين قصيدة، بعض القصائد تحتوي على أكثر من مائة وخمسين بيتا، معظمها ظهرت على صفحات المجلات والرسائل الصادرة من المدن المختلفة بالهند أمثال مجلة ثقافة الهند من دلهي الجديدة، ومجلة المجمع العلمي الهندي بعليكرة، ومجلتي البعث الإسلامي، والرائد من لكناؤ، ومجلة برهان الأردوية من دهلي، ومجلة

المدرسة العالية بكلكتا، ومجلة إندوإيرانيكا من كلكتا وكاروان أدب من لكناؤ. وكذلك وردت بضع قصائده في مقدمة الكتب مثلا قصيدة رائعة له ظهرت في مقدمة كتاب روائع الأعلاق في شرح تهذيب الأخلاق للأستاذ أبي سحبان روح القدس. إضافة إلى ذلك

عثرت على بعض الأبيات التي أرسلها الشاعر المعصومي إلى أصدقائه وتلاميذه. وهي مازالت غير مطبوعة حتى الآن. ومهما تكن أشعاره حجما وانتاجا تدل على أنه كان شاعرا مطبوعا.

أغراض شعره وموضوعاته:

نظم الشاعر المعصومي في الأغراض المختلفة التي شاعت في عصره فأبدع فيها وأجاد.

المراثي:

له عدة مراثي، رثا بها أساتذه المخلصين والعلماء البارزين الذين تركوا آثارا علمية ضخمة في ميادين العلوم والفنون. فمن مزايا المراثي للشاعر المعصومي أنه يصف فيها سيرة حياة الفقيد وشمائله وأوصافه الحميدة وخصاله النبيلة. يذكر خدماته التي قام بها في العلوم الإسلامية والثقافة العربية وكذلك خدماته الجليلة في المجلات التربوية والدينية والإصلاحية الثقافية.

في جانب آخر يسلط الشاعر المعصومي على الجوانب الأخرى للراحلين من بين شخصياته العلمية والأدبية التي نالت سمعة ولقيت تقديرا من الحلقات الثقافية. هذه النزعة مهمة من ناحية المعلومات القيمة بما تتعلق بالراحلين.

إضافة إلى ذلك اعتنى الشاعر المعصومي بإلقاء كافة الأضواء على مناقبه

العلمية وفضله في معرفته بالعلوم الإسلامية والثقافة العربية وحظه في اللغة العربية آدابها كما إهتم الشاعر بذكر صلته بالفقيدين.

يعبر الشاعر المعصومي عن شعوره العميق وآحزانه الشديدة وعواطفه الجياشية على وفاة الراحلين. ووصف في بعض المراثي أن الإسلام قد فقد أحد العلماء الكبار وكان المسلمون في حاجة إلى أمثال هؤلاء العلماء وأن الأمة المسلمة تحتاج إلى الزعماء المصلحين أو الأساتذة المخلصين ليصلحون الأمة أو يزينون الطلاب بحلية الثقافة الإسلامية والحضارة العربية ويحرضوهم على سلوك الأسلاف الصالحين.

خير مثال للمرثية التي قرضها الشاعر المعصومي عند وفاة السيد أبي الحسن على الحسني الندوي- يظهر في القصيدة صدق شعوره عمق حزنه وإخلاص عواطفه ومشاعره كما أنه يذكر مناقبه العلمية وفضائله الأدبية وانجازات العالية في مضامير العلوم الإسلامية والعربية إضافة إلى ذلك أنه يصف أخلاقه النبيلة والجوانب الأخرى لحياته الشخصية العلمية بأحسن الأسلوب وأبدع التراكيب. فيقول:

قد كان غرة وجه الهند نيرة ... منها استضائ السنا الأقوام والنحل
سحبان دين اللهدى طابت خطابته ... لم يستقم دونها علم ولا عمل
باليعربية من تنميقه كتب ... للأوردية من تحبيره حلل
مؤلفات له مشحونة غررا ... بها المجامع طول الدهر تحتفل
أصغى إليه قحاح العرب إذ سمعوا ... مغزاه وهو بفصحى الضاد يرتجل
تجسمت دعوة الإسلام فانقلبت ... تدعى (عليا) به العلياء تكتمل

الله أعطاه فضلا واسعا ويدا ذوادة عن حمى الإسلام لا تشل

مرثية شيقة له بعنوان "رثاء الأديب الكاشغري" نظمها عند وفاة شيخه الأديب الكاشغري الندوي. هذه مرثية رائعة، أحسن جمالا وأقوى شعورا وأعمق حزنا- وصف الشاعر فيها جوانب متعددة لشخصيات أستاذه المخلص بأسلوب أنيق جذاب فمطلعها:

يقولون مات الكاشغرى، فقلت، لا أصدقكم يوما وإن لم أكذب
فحرصى على بقياء، غير مصدق وعلمى بأمر الله غير مكذب
وما النفس إلا لمنايا فريسة وإن هى كانت نفس حر مهذب

ومرثية أخرى قرضها حول العنوان "رثاء الأستاذ سعيد أحمد الأكبرآبادي" ليست أقل روعة وجمالا وحزنا وعاطفة- تحتوي على ثلاثين بيتا أنيقا- استهلت المرثية بالأبيات الرائعة التالية:

ملا عيون الحجى تهمي مآقيها ملا جفون النهى تجري سواقيها
على فقيد السنايا في مكانته على وحيد السجايا فى معاليها
من عاش عيشة حر في معاطفه لم تطو إلا على طيب مطاويه
(سعيد أحمد) أضحى رهن مضجعه من أرض (دبيل) في أدنى مغانيها
مدينة (التاج) تبكي الآن واحدها و(غرب بنغالة) ترثي مؤاخيها

المناسبات:

التهنئات والترحيبات التي قد نظمت للحفلات الخاصة أو للحفلات الشعرية تدخل في ضمن القصائد " المناسبات" قرضها الشاعر المعصومي بضع تهنئات وترحيبات بمناسبة خاصة مثلا أنه قرض تهنئة

لتلميذه الرشيد الشيخ عبد المجيد بمناسبة زفافه مع الآنسة "سلطانه شهناز كما أنه نظم تهنئة أخرى بمناسبة استكمال عقد الزواج الميمون "لهدي بيغم" بنت الدكتور محمد راحة الله الأزهري مع محمد مسعود الزمان مندل بن مسلم مندل- أولا يذكر الشاعر المعصومي أن عم السرور والفرحة في العالم حتى الغضون والأكمام راقصة وباسمة ثم يهنئ تهنئة حارة بالزواج ويمدح جمال الخلق والخلق للعريس والعروسة. إضافة إلى ذكر الأوصاف الجميلة والمدائح الحميدة أنه يذكر الأمور المهمة الأخرى المتعلقة بهذه المناسبة وينصح لهما أن تصبحا هديها قدوة للآخرين. فهاكم نموذجا من أشعاره بمناسبة الزفاف:

جاءت البشرى بأضعاف السرور والصبا تلثم أفواه الزهور
ووريقات الغصون اللدن نشوى أثرت فيها تلاحين الطيور

ملئت بشرى قلوب القوم طرا فانبرت ترمي بأنفاس العبير
حبذا: جاءت (هدى) بنت (محمد راحة الله) هديا ذات نور
زوجت بالكفوء موسوما بسور هو حقا للزمان خير سور

نظم ترحيبا طويلا تحت العنوان " ترحيب بسمو الحاكم العام" وأنشدها في حفلة لتوزيع الشهادات التي أقامتها اللجنة التعليمية بمقاطعة بنغال الغربية في يوم السبت الموافق الرابع والعشرين من شهر نوفمبر عام 1951م برئاسة صاحب السمو الحاكم الدكتور هرندرا كُمار مكرجي- (Harendra Coomar Mukharjee) المتوفى سنة 1956م - أولا يمدح الشاعر سمو الحاكم العام المولع بترويج العلوم والفنون في بضعة

أبيات ثم يسلط كافة الأضواء على إسهامات قامت بها المدرسة العالية في إشاعة العلوم الإسلامية والفنون العصرية وفي الحفاظ على التراث الحضاري الهندي. إضافة إلى ذلك اهتم الشاعر بذكر بعض الحوادث التاريخية التي مرت بها المدرسة قائلا:

لله در حكومة عزمت على تأسيس دار هتكت حرماتها
لله درحكومة وطنية أحي المعارف سيبها وهباتها
وتضمن التاريخ جل حوادث تتلى مدى الأيام ما جرياتها
عزر الفعال تلوح واضحة وإن خلت العصور وقبلت صفحاتها

من أجود رسائله المنظومة في مناسبة التهنئة هي قصيدة التي أرسلها إلى فضيلة الأستاذ المحقق مختار الدين أحمد في مناسبة حيازته لـ"جازة الرئيس من قبل رئيس جمهورية الهند اعترفا بخدماته القيمة في اللغة العربية وآدابها- سنة 1989م. هذه قصيدة رائعة تحتوي على سبع وثلاثين بيتا. أحاط الشاعر بها أكثر الجوانب لشخصية المحقق من الحياة التعليمية والثقافية والدراسية الوظيفية كما أنه تناول فيها نشاطاته العلمية والأدبية وانجازاته فيها بشكل الجوائز التقديرية منجانب المراكز الثقافية المختلفة. فلاحظ بعض الأبيات التالية من القصيدة:

نخيل المنى فا الحمد لله أثمرا وصبح الهنا عن ساطع النور أسفر
وهبت على روض القلوب نسائم دعت زهرات الحب أن نتفرا
إلى (أحمد) المختار للدين أسلكت بشائر قد طابت حديثا ومخبرا
فسرت قلوب السامعين وأبهجت أخلاء صدق معشرا ثم معشرا
فأكفائه قد هناؤه بمنحة أتيحت له، ملية، فتصدرا
لها سمة غراء (رشتربتية) حكومية زادته عزا مجمهرا

تأسربهم شخصى فهلل ساير على إثرهم بالتهنئات كبرا
ومارمت أقصى شأوهم غير أننى تلوت خطاهم حيث لن أتاخرا
فزرت على متن الخيال جنابه إذا لم أصادف مركبا لى تيسر
لأنشده مما ابتكرت قصيدة أضمنها من خالص الود مضمرا
جعلت له غرا التهانى قلادة فرائدها تحكى الدراي منظرا

وله قصيدة لامية رائعة باسم "أغانى التهاني" قالها بمناسبة ظهور كتاب لطيف باسم "شعراء الرسول في ضوء الواقع والقريض" لصاحبه للأديب الشيخ سعيد الأعظمي. فهاكم بضع أبيات منها:

الوصف والمدح:

لقد نظم عدة قصائد في الوصف والمدح أكثرها ظهرت على صفحات الجرائد والمجلات. من أهم القصائد في هذين الغرضين قصيدة "مدينة كلكتا عبر ثلاث مائة"، قصيدة "ذكرى العبد العزيز الميمني الراجكوتي"، قصيدة على الدكتور محمد إسحاق مؤسس "جمعية إيران" بكلكتا، قصيدة "قصة المسير إلى مباركفور"، وقصيدة "أدب الحديث".

كما ذكرت أن الشاعر المعصومي قد ظهرت موهبته الشعرية في عنفوان شبابه ونظم قصيدة وهو طالب في المدرسة العالية بكلكتا، أعجب بها شيخه المحدث الفقيه مولانا المفتي السيد محمد عميم الإحسان حتى شاملها في كتابه الشهير "فقه السسن والآثار" فهاكم الأبيات التالية:

هام الفواد وما له يتبختر وإذا تميس يراعتي فاالمحبر
فكان غانية سلافة فطرة طلعت فما برح استهيم المزبر

من أجمل قصائده وصفا حسنا هي قصيدة "كلكتا عبر ثلاث مائة" نظمها بمناسبة استكمال مدينة كلكتا ثلاث مائة سنة- ظهرت على صفحات المجلة "ثقافة الهند" دلهي. استعرض الشاعر في القصيدة النشاطات العلمية والأدبية والثقافية في المدينة كما أنه استعرض الحياة الاجتماعية والسياسية فيها عبر ثلاثة قرون. تناول فيها الجوانب التاريخية والثقافية المختلفة للمدينة مع ذكر المراكز الثقافية القديمة والمعاهد التعليمية العريقة فيها. ومن الممكن أن نرى في القصيدة وصفا دقيقا للمدينة وما يتعلق بها بأسلوب رائع. فمطلعها:

مدينة (كلكتا) تريك رحابها روائع شتى لم يخنها شبابها
تأنقت الدنيا على ما تقادمت بمدن حديثات المبانى كِعابها
فمنهن (كلكتا) الأنيقة، خلتها فتاة زهاها وشيها وسخابُها
(ثلاث قرى) صارت أقانيمها معا على شط (هُغلى) حيث تم انتصابها
(تشارنك) العملاق ألقى بها العصا فأصبح مأوى (الإنكليز) جنابُها

من أجود قصائده في الوصف والمدح هي قصيدة قرضها الشاعر المعصومي تحت العنوان "ذكرى العلامة عبد العزيز الميمني الراجكوتي" تتضمن مائة وثماني وخمسين بيتا- بذل الشاعر قصارى جهوده في إحاطة شتى الجوانب لشخصية العلامة الميمني تحت العناوين الفرعية التالي:

التوطئة، شيوخ الميمني، علاقة الشاعر بالشيخ المكي، تلاميذ الشيخ المكي قبل الميمني، مجئ الميمني إلى شيخه المكي، شيخ ثالث للميمني، اختصاصه باللغة العربية، رحلته إلى إستنبول ومصر، أمكنة أقام بها مدرسا، مسيره إلى عليكره، أبو العلاء وما إليه، سمط اللآلي، إنتصاره القالي في

السمط، مآخذه على البكري، إعجاب علماء العرب بالميمني، رد الميمني على غواة الإستشراق، ثلة من خلانه، مسايرته لأعلام العرب وثناؤهم عليه، عودة إلى وصف أعماله، نقله إلى باكستان، فرية حساده، جوده ودسائعه، تلاميذه، الأستاذ امتياز علي خان عرشي، الدكتور يوسف، الدكتور خورشيد فارق، الدكتور مختار الدين أحمد، حافز الشاعر على قرض هذه الكلمة، صلة الشاعر ببعض شيوخ الميمني، شيخي الكاشغري والعلامة الميمني، ولوع الشاعر بأعمال الميمني ومدرسة أساليبه، نكت الشاعر على بعض الآثار الميمنية، ضراوته باللغة العربية، مظاهر رحمة الله، عودة إلى قطين الحنايا، لغة الذكر، الصلاة والسلام على سيدنا النبي وآله وصحبه.

الدكتور محمد أجمل أيوب الإصلاحي الذي اعتنى بترتيب وتدوين البحوث والمقالات للشاعر، يكتب عن قصيدته "ذكرى العلامة عبد العزيز الميمني الراجكوتي:

قد رأينا أن نستهلها بقصيدة الأستاذ العصومي التي قيلت بمناسبة صدور عدد خاص لمجلة العلمي الهندي عن العلامة الميمني. وقد أشرنا إليها في بداية كلمتنا هذه، وهي قصيدة طويلة بلغت أبياتها ثمانية وخمسين ومائة بيت(158). ضمنها الشاعر ترجمة الأستاذ الميمني، فذكر بعض شيوخه وأصحابه وتلامذته، ورحلاته العلمية ومراحل حياته المختلفة، نوه باختصاصه باللغة العربية ومجاراته في علمها فحول علماء العرب من معاصريه وثنائهم عليه، كما وصف فيها أعمال الأستاذ الميمني، خص بالذكر منها كتابيه (أبو العلاء وما إليه) و(سمط اللآلي) وأشار إلى شغفه بها وبدرسة

أساليبه كما سبق، ثم أقبل على بيان "ضراوته باللغة العربية" قائلا:

حنايا ضلوع، شاق حر قطينها طواها على جمر الغضا أو غضا الجمر
يجاوت ورق اللابتين بطابة عساها بواري الزند في صدره تدري
له كبد حرى إلى جيسوانة تساعفه بالظل في وغرة الحر
تمنح إلفا آلفا أو مؤلفا بأحلى جنى عذق ابن طاب أو البسر

أفاض بعد ذلك في تعداد فضائل اللغة العربية (لغة الضاد) ومزاياها معربا عن اعتزازه بها، في أبيات تذكرنا بالقصائد التي كان يلقيها العلامة محمد بهجة الأثري – رحمه الله – وغيره في المؤتمرات السنوية لمجمع اللغة العربية بالقاهرة. وإليكم خاتمة الأبيات:

ولولا مزايا الضاد لم تصم مهجتي (عيون المها بين الرصافة والجسر)
وما كادت اقسحى تطيش سهامها فقد نفذت أزلامها كبد الصخر
ثنائ على الفصحى لسان سريرتي وعنوان تبجيلي لأصحابها الزهر

وصاغيتي فوق البضائع كلها وإن لم أكن رب البضائع كالتجر
على كل ذي حق نثرت جماعها فها أنا ذا مغري بذي منن غر

وهكذا رجع إلى الثناء على العلامة الميمني مرة أخرى. ثم أخذه بعض ما يأخذ الشعراء في أوج تحليقهم فانثالت أبيات أجتزئ منها ببيتين فقط:

ثنائي على عبد العزيز أفادكم معلقة لو زدتموها على العشر
مذهبة هندية يعربية تعلق من جيد الزمان على النحر

وقد علق الأستاذ المعصومي على قصيدته لتفسير الإشارات الكثيرة

التي وردت فيها، وترجم في الحواشي للأعلام الذين ذكروا في القصيدة، فحشاها بفوائد غزيرة تتصل بتاريخ العربية في الهند"

الغزل:

وله فيه قصائد عديدة، وجنح إليه الشاعر المعصومي في مدح الكتب أو وصف المناظر الجذابة والوادى الخلابة والنهور البهيجة والمشاهد الجميلة كما نظم عديد الأغانى والأناشيد في بيان جمال المناظر الريفية والطبيعية وغيرها. من أجود قصائده في هذا الغرض قصيدة "أغانى الشعب الكشميري" مشتملة على الأناشيد بمختلف المناسبات مثلا أغانى الفلاحين، أناشيد جهييلم - نهر الحب، أناشيد ملاك الحب، أناشيد الشال الكشميري، أغاني الزواج، أغانى الربيع، أغانى الحضانة.

نماذج من أغانيه:

أغانى الفلاحين:

أنت كالعقيان في اللمعان

ياورد الزعفران،

أنت كالعقيان، في اللمعان

أفديك بكلي، ياورد الزعفران

أنت كالعقيان في اللمعان

إنك تلوح كالسراج الوهاج

في الليلة القمراء،

إنك تلوح كالسراج الوهاج

أفديك بكلي، يا ورد الزعفران

أنت كالعقيان في اللمعان

أغاني الزواج:

بعد البسملة نبتدىء أغاني الزواج

الله أسعدنا بهذا اليوم السعيد

ليكن هذا الورد متفتحًا على الدوام

ولتدم هذه النهيرة المباركة دافقة

المراجع والمصادر

المصادر العربية:

- أبو محفوظ الكريم المعصومي: بحوث وتنبيهات، (ج.1-2)، ط. دار الغرب الإسلامي، بيروت 2001م.
- عميم الإحسان: فقه السنن والآثار، ص. 397-398، ط. المطبع المجيدي كانفور، 1373هـ.
- عبد الحي الحسني: نزهة الخواطر، ط. دائرة المعارف الإسلامية، حيدرآباد الدكن.
- عبد الحي الحسني: الهند في العهد الإسلامي، ط. مجمع الإمام أحمد بن عرفان الشهيد، دار عرفات، رائبريلي (الهند) 2001م.
- عبد الحي الحسني: الثقافة الإسلامية في الهند، ط. مجمع اللغة العربية بدمشق 1983م.
- عبد العزيز الميمني: سمط اللآلي، ط. لجنة التأليف والترجمة والنشر 1936م.
- عبد العزيز الميمني: أبو العلاء وما إليه، ط. المطبعة السلفية، القاهر، 1344هـ.
- قاضي أطهر المبارکفوري: رجال الهند والسند، ط. المطبعة الحجازية، بومبائ، 1958م.

- مولانا أبو سحبان روح القدس الندوي: "روائع الأعلاق" شرح تهذيب الأخلاق، ط. لكناؤ، 1419ه.

المجلات والجرائد العربية:

- مجلة المجمع العلمي العربي بدمشق، المجلد 34، الجزء الثاني، والجزء الثالث، سنة 1959م.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، المجلد 27، عدد ربيع الآخر، 1404هـ.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، عدد ربيع الأول—جمادى الأخرى، 1406هـ.
- مجلة المجمع العلمي الهندي، عليكره، المجلد 5، 1400هـ.
- مجلة المجمع العلمي الهندي، عليكره، المجلد 1، عدد يونيو، 1976م.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، عدد ربيع الأول، 1398هـ.
- مجلة الدراسات الإسلامية، إسلام آباد، المجلد 1، عدد مارس، 1965م.
- مجلة الدراسات الإسلامية، إسلام آباد، عدد يونيو 1969م.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، عدد ربيع الآخر وجمادى الأولى، 1399ه.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، عدد ربيع الأول، 1412هـ.
- مجلة البعث الإسلامي، لكناؤ، عدد ربيع الأخرى، 1410ه،
- مجلة المجمع العلمي الهندي، عليكره، المجلد 5، 1980م.
- مجلة ثقافة الهند، دلهي، عدد أبريل، 1960م.
- مجلة ثقافة الهند، دلهي، عدد يناير، 1963م.
- مجلة ثقافة الهند، دلهي، عدد أبريل، 1964م.
- مجلة ثقافة الهند، دلهي، عدد أبريل، 1969م.
- مجلة ثقافة الهند، دلهي، العدد المزدوج 3-4، سنة 1983م.
- مجلة المجمع العلمي الهندي، عليكره، المجلد 9، 1984م.
- مجلة المجمع العلمي الهندي، عليكره، المجلد 11، 1986م.
- مجلة المدرسة العالية، كلكتا، العدد الأول، سنة 1951م.
- مجلة المدرسة العالية، كلكتا، سنة 1972م.

المصادر الأردوية:

- أبو الحسن علي الندوي: هندوستان كي قديم درسگاهيں، مطبه معارف، 1971م.

- السيد محمد ميان: علماء هند كا شاندار ماضي، دهلي، 1960م.
- القاضي أطهر المباركفوري: هندوستان ميں عربون كى حكومتيں، ندوة المصنفين، دهلي، 1967م.
- مولانا عبد الستار: تاريخ مدرسه عاليه، كلكتا، 1959م.

المجلات والرسائل الأردية:

- مجلة معارف، أعظم كره، المجلد 62، عدد سبتمبر، 1948م.
- مجلة معارف، أعظم كره، المجلد 63، عدد أبريل، 1949م.
- مجلة معارف، أعظم كره، المجلد 71، عدد مايو، عام 1951م.
- مجلة معارف، أعظم كره، المجلد 83، عدد يونيو، 1959م.
- مجلة برهان، دهلى، المجلد 43، عام 1959م.
- مجلة برهان، دهلى، المجلد 29، عام 1952.
- مجلة برهان، دهلى، المجلد عام 1956، 1957م.
- مجلة برهان، دهلى، المجلد 70، عام 1973،
- مجلة برهان، دهلى، عدد مارس، عام 1979،
- مجلة برهان، دهلى، عدد أغسطس، 1950م.
- مجلة برهان، دهلى، عدد يوليو، عام 1952م.
- مجلة العلوم الإسلامية، اداره علوم إسلامي، مسلم يونيورستي عليكره، ج. 1، عدد يونيو، 1960م.
- مجلة العلوم الإسلامية، اداره علوم إسلامي، مسلم يونيورستي عليكره، ج. 2، عدد دسمبر، 1961م.
- مجلة العلوم الإسلامية، اداره علوم إسلامي، مسلم يونيورستي عليكره، عدد يونيو، 1962م.
- مجلة العلوم الإسلامية، اداره علوم إسلامي، مسلم يونيورستي عليكره، عدد يونيو - ديسمبر، 1966م.
- مجلة روح أدب، اردو أكادمي كلكتا، عدد أبريل - يوليو، 1990م.
- مجلة روح أدب، اردو أكادمي كلكتا، عدد يناير، 2000م.

المصادر الإنجليزية:

- Muhammad Muhar Ali: History of the Muslims of Bengal, Saudi Arabia 1985.

- Dr.Mojibur Rahman:History of Madrasah Education, Calcutta 1977.
- N.N Law: Promotion of Learning in India,
- Bengal, Past & present Vol. VII, Vol. VIII 1914
- Major Basu: Eductation in India under East India Company
- W.W. Hunter: The Indian Musalmans
- Syed Azizul Hauque: History and Problems of Muslim Education in Bengal (1917).
- Souvenir Calcutta Madrasah College Bicentenary Celebrartion-1985
- Dawn "Madrasah Aliah Magazine" published on the occasion of Calcutta Madrasah College, post bi-centenary silver jubilee celebration of 225 years of education & culture, February 17-19, 2006.

INDIA: PAST AND PRESENT

Government Girls' General Degree College
7, Mayurbhanj Road, Kolkata-700023
India

INDIA: PAST AND PRESENT

Editor-in-Chief
Dr. Shafiqul Islam
Co-Editor:
Dr. Md Shahid Jamil

College Editorial Board:
1. Dr. Nandini Jana
2. Dr. Soma Mandal
3. Dr. Shahid Jamil

First Edition: June 2023
ISBN: 978-81-974371-7-5
Published by:
Dr. Syeda Shariqatul Moula Alquadri
Principal
Government Girls' General Degree College, Kolkata
7, Mayurbhanj Road, Kolkata-700023.

Website: www.govtgirlsekbalpur.com
Phone: 033 22481160/ 033 22481171
© Internal Quality Assurance Cell,
Government Girls' General Degree College,
Kolkata.
Price: Rs.500/-
Printed by: Bharat Art Press, Kolkata-14

All rights reserved. No part of this Publication may be reproduced, stored in a retrieval system or transmitted, in any form or by any means without their prior permission in writing of the Publisher.

Views expressed in this Publication are exclusively those of the authors and do not necessarily bear the opinion of the Editor or the Publisher or other personalities associated with this

Contents

From the Principal's Desk 4

Foreword 5

Articles:

A Study of changing ethics within marital relationships 7
__*Dr Madhumita Sen*

Role of Sufis of India for the promotion of Ganga-Jamuni Culture 20
__*Dr. Syed Md. Iqbal Shah Alquadri*

The Toxic War of the Fan Clubs at the Digital Spaces: Analysing Abusive Sub-Culture in Indian Cinema 33
__*Roudrajjal Dasgupta*

Translations:

The Return 47
__*Dr. Debaprsad Bannerjee*

Bionotes 60

From the Principal's Desk

It gives me immense pleasure and pride to place the present book India: Past and Present in the reader's hands. Government Girls' General Degree College, Kolkata has been dreaming about a book containing research articles for the past few years. Our dream came true when we receive many research articles from different scholars. This book has 15 research articles from different disciplines. The articles reveal the richness and intellectual deepness of the scholars. I express my deep gratitude to all who have extended their wholehearted cooperation during the entire gestation period of the book. I owe a special debt of gratitude to all the members of the journal committee for completing this work with flawless accuracy and efficiency.

Principal

Foreword

Government Girls' General Degree College, Ekbalpur, Kolkata is one of the multilingual colleges in West Bengal. Its faculty members have been engaged in various research activities in different subjects and languages. In this perspective, this multidisciplinary book entitled 'India: Past and Present' is being published. The comprises different studies on various subjects ranging from sociology to history and literature in different languages, e. g. Arabic, English, Persian and Urdu. All these pieces of writings are solely about our motherland India: its history, society and its languages and literatures. Out of the total fifteen articles included in this book, four are in English, nine are in Urdu and two are in Arabic language. The first English article discusses the change in the institution of marriage in urban society, the second study throws light on the role of Sufis in promotion of harmony, coexistence and love in India, the third paper is about abusive activities of fan clubs of various Indian superstars on virtual media to demean each other's respective idols and the fourth piece of writings in English is in fact translation of a portion of autobiographical reminiscences of Jayanta Mahapatra. It depicts the poet's childhood and adolescence.

The first article in Urdu explores the philosophy of love and humanism in the works of the Indian poet Amir Khusraw. The second paper examines the ideas of the famous Urdu poet Sahir Ludhianvi, while the third article delves into the philosophy of famous Persian poet Maulana Jalaluddin Rumi, focusing on tawhid (the unity of God) and emphasizing that all creation is inter-

connected and reflects the divine. The fourth article reviews the work of the Urdu novelist Qurratulain Hyder, particularly her novel ‘River of Fire’, where she highlights the oneness of human nature amidst nationalist and religious upheavals in Indian history and advocates for an inclusive culture.

The fifth paper is a review of Ishrat Betaab’s story ‘Behisi’, which portrays the social issues faced by the third gender. The sixth study is about the role of the Quadiriya Order in promoting love, humanity, and knowledge. The seventh paper explores the journalistic career of Khawaja Ahmad Abbas, while the eighth paper examines Majnun Gorakhpuri as a writer of romantic fiction. The author of the ninth article provides an analysis of Seemab Akbarabadi's poetry collection ‘Loh-e-Mahfooz’.

Our book consists of two papers in Arabic language. The first one throws light on the life and works of the great Indian scholar and freedom-fighter Allama Fazle Haq Khairabadi. The last study analyses the collected Arabic poems of the Internationally acclaimed Arabic scholar of Kolkata Abu Mahfuz al-Karim al-Masumi.

This is summary of the contents of the book. We are thankful to everyone who helped us at various stages by their suggestions in bringing out this book.

We are deeply indebted to Dr. Syeda Shariqatul Moula Alquadri, the respected principal of our college for her encouragement and patronage.

The Editors

A Study of changing ethics within marital relationships

__Dr Madhumita Sen

Abstract

Metropolitan cities thrive on the tension between tradition and modernity, between the ethics of law and the ethics of situation. The ethics of law imposes a predetermined pattern to live by. Life in rural agricultural communities and smaller towns is often lived securely under the sovereignty of laws, customs, social conventions, and local ethos.

But urbanity, properly so-called and more so in a metropolis, tends to diminish the rule element in the lives and belief system of the people.

Further, life in a metropolis is futuristic; it looks to the new; an action is determined in relation to the new, novel situations. Metropolitan life seeks an ethic that takes the risk of emphasizing the situation rather than the law; the future and the new rather than the traditional.

There is a grab of anonymity and ambiguity regarding the roles and identities of the persons in a metropolitan situation.

Under such a condition there seems to be a vast change in the structure of the institution of marriage and family especially in an urban social reality.

Marriage, as a structured relationship, tends to restrict deviations from the roles and expectations. It is an acknowledged and hence public. Individuals within

the structure of marriage are not identified as individuals per se, but rather with roles.

Thus, there obtains a tension within the structure between the individuality of the partners vis-à-vis their roles. This tension is more acutely felt by the wife, more so if she is educated and has an access to the wider world beyond her family in connection with her job in a crowded city.

For the metropolitan working women, this leads first to a dual role structure and then to a metamorphosed role definition which creates the power to redefine the traditional ethics.

In his distinguished essay on **Man in the Modern Age** [1], the philosopher Karl Jaspers has offered an important insight into the plight of the family and home-life in modern-day society. Conventional connubial relations face increasing stress under the influence of economic and social struggles for financial independence and well-being. The continuous and dynamically changing struggle has led to a technicisation of love marked by the growing eroticisation of heterosexualrelationships, increasing frequency of abortion, the ever-increasing incidence of divorce and the expanding incidence of sex unbound by marriage. With its origins in the metropolitan geographies where it now has deep roots, this trend is now spreading to other

[1] First published in English in 1933. Routledge (Revivals), April 4, 2014

developing cities and towns. Metropolitan societies are marked with a well-founded acceptance of***Ethics of Situation*** as against the ***Ethics of law or Ethics of Custom***.

The ***Ethics of Law or Ethics of Custom*** imposes a predetermined pattern of life with relationship dynamics driven by precedence of "how things have always been". Life in rural agricultural communities, as well as in smaller towns, is often lived secured by the sovereignty of laws, customs, social conventions and the local ethos. The notion of "situation" driven existence is rare in the traditional societies, which rarity is seen in scattered incidences, even today, in its pure forms in rural and non-urban societies. This evolved norm that drives day-to-day life is what we refer to as the Ethics of Law or Ethics of Custom.

However, urbanity tends to diminish the rule-based routine in the lives and belief structures of the society. With the availability of resources and economic ability to acquire solution choices, diurnal life is marked by a search for better and more unique solutions to situational issues, thus the ***Ethics of Situation***. This fuels anonymity and ambiguity concerning the roles and identity of the individual in metropolitan situations leading to mutual alienation and an anti-nominal existence.

Simmel, in his book 'The Metropolitan and Mental Life' [2] discussed the issue of the constantly

[2] Published in 1971. Originally a part of a series of lectures carried out by Georg Simmel & his associates discussing

changing and shifting character of urban life. He pointed out that urban mentality encourages a matter-of-fact approach towards life. The bustle of everyday life creates an attitude of distance and withdrawal, even indifference and detachment from mundane commitments and involvements.

The general acceptance of Ethics of Situation as the guiding structure[3] for metropolitan life inherently renders life into a forward-looking journey of tackling every situation as a project that needs to be discovered and managed to a conclusion (Sartre, Simon de Beauvoir)[4]. This is essentially life as it adapts to an environment that is characterized by an ever-increasing rate of change that is percolating across the society as it moves away from tradition therefore eliminating the chances of looking to precedence for solutions.

Thus, the contrast with the Ethics of Law or Ethics of Custom is deepened as we are faced with newer and more challenging situations. Law of Ethics or Custom is one that focuses on bringing long-lasting equilibrium and emotional and social security and is very often marked with stagnation. As society moves away from a "past-focused" (a custom and tradition-driven life) life to a forward-looking existence; the danger of

---

different aspects of social urban life at the turn of the 19th century.

[3] Structure" in the present study refers to a socially approved set of relationships.

[4] Jean-Paul Satre, 1905-1980. Simon de Beauvoir,1908-1986.

stagnation is replaced with increasing complexity and anxiety in life.

An essential part of this work would be to gain an understanding of the existential framework that drives relationships in and by virtue of marriage. The further intention is to explore the feelings of boredom and urges to escape[5] and acquired freedom experienced by the partners within the marital structure in the metropolitan scenario.

Metropolitan [6] life is invariably subject to the interplay of ideological and external forces. Life in a metropolis is also exposed to political or economic factors. Either of these is enough to generate feelings of frustration and anxiety. Without denying the causal effect of such factors, marriage partners amongst the educated middle class, employed in a metropolitan area, are motivated more by ideological considerations besides others. The intention here is to examine these ideological considerations as they change and impact the institutional structure of marriage.

Search for Situation within the Boundary: The married and working woman seeking relief from her routine existence actively pursues differentalternatives.

Her experiments with the modes of relief from routine may, in the beginning, start at her home with her spouse as well as her children and the inmates of the family. This effort often manifests itself in increased

---

[5] Escape" is the mode of relief from a monotonous routine.
[6] Metropolitan" refers to a large busy city. The present study was conducted in the City of Kolkata.

family-centered activities such as dining out, shopping, etc.

Sooner or later, the experimental venture assumes the characteristics of routine life and an ethic of situation becomes a customary ethic, therefore, leading back to the epicenter of the problem.

***Search for Situation outside the Boundary*:** It is point of common observation that in a metropolis when partners in marriage are of a middle-class upbringing, educated, and working, they find/seek surplus relationships and situations outside the conventional framework of the family. The data in support of the observation is neither meagre nor deviant. The partners do not reject or discard their conventional roles but attach significant value to their roles as wives, husbands, and parents. And yet their ideas about the quality of life at the emotional plane, in its total significance, are found to be inadequately realisable within their conventional and routine roles. There remains, even grows, a longing to explore outside the customary boundaries, an expectation for a novel manner of realizing one's individuality beyond the confines of the custom or law-defined married life.

The Simmelian study on "The Metropolitan and Mental Life" also points to the dynamics of change in metropolitan life stimulating the intellectual aspects of human personality while the rural communities are based purely on emotional ties.

Discovery of the Surplus Self: The situations faced and often voluntarily encountered by the working women in a metropolis, allow such relief by means of

opening avenues to explore the Ethics of Situation, requiring the woman to discover her *surplus self*. This is a process of iterative discovery with an ever-expanding spiral seeking avenues of stored ideas and pent-up creativity and enterprise. Roles within and identified by the marriage relationship tend to exhaust and to an extent pose a limitation to one's creative potential by pinning one down to an acknowledged or conventional framework. Entering into an unconventional relationship presents the opportunity to discover and pursue the surplus or creative side of human beings.

The ever-widening tryst outside the norm-driven boundaries presents their own set of unique problems.

i. What starts as a new and fresh avenue tends to become conventionalised as soon as expectations begin to set in. Thus, the ethics of situation soon fall back into the ethics of law and custom leading to increased complexity and widening of the defined boundaries.

ii. The initial lure of freedom may prove to be a delusion. By virtue of being a structure within a larger structure, very soon the rules of any structure become instruments of control with rules and restrictive ethics.

iii. Very often the social structure redefines the role into an independent characteristic that is marked with inequity. E.g., the rules get differentiated for a married member of the flight crew and an unmarried member of the flight crew.

STRUCTURE AND FREEDOM IN MARRIAGE

Marriage is a structured relationship. The structure is conventional and bound by routine as far as the roles of the partners are concerned. The traditional structure restricts deviations from the roles and expectations and hence restricts freedom. This structure provides emotional and social equilibrium. But an individual constrained by the structure from expression of independent entity within tends to resist structural confinement of the custom-defined role and hence seeks freedom vis-à-vis their roles. Freedom without structure disrupts emotional and social equilibrium leading to insecurity and overwhelming anxiety.

Marriage, as a structure, is created to establish security and social identity. But its public character, entailing acknowledged roles and expectations, is experienced as unduly restrictive and a consequent loss of personal identity. Gradually, with an increasing pace, the structure of independence is reinforcing its own identity and situational ethics to break away from the customary ethics that has been designed to constrain freedom from social norm-driven interaction at play.

Freedom vs. Structure - Ethics of Situation

The recent changes in expectations within the structure of family and marriage are reflected with women acquiring professional qualifications and pursuing careers, rather than just jobs. A strong expression of the individual attempting to break away from the “constraints” of the marital structure has been manifested.

A dramatic change in the attitude of young, urban, educated Indian husbands follows. Instead of revolting at the prospect of the wife pursuing career equity, we see a paradigm shift in actual encouragement, even at the cost of physical separation (in different locations/cities). Such separation is a strong syndrome of the marital structure tending to readjust itself to the changing reality that is driven by financial and social aspirations.

Working couples were emphatic about the element of "understanding" between the partners in marriage [7]. It is observed that the practice of couples living in different cities is not new to urban India.

What is new is the motive behind the separation. Whereas earlier, wives opted to stay back only when the children's education was at stake, today more and more women are staying behind, or more radically, moving to another city, to further their own careers and to satisfy their own ambitions. Thus, with more and more couples opting for professional careers, the expectations in marriage among the educated urban Indian, seem to be witnessing a vast change.

Key Drivers of Social Restructuring in Developing Economies

Education, awareness about the value of personal selfhood, and alternative models of a better life.

Technology gives leisure from household chores, and the media disseminates wider perspectives of life.

---

[7] Partners in marriage" refers to the husband & the wife who together aim to set up a family

The metropolitan life demands an expensive standard of living and offers avenues for making a higher standard of life possible.

Structural rigidity is lessened by the anonymity of urban life. There is a taste of freedom, as escapes* from structure, become viable while still retaining the structure.

INDIVIDUAL FREEDOM – EVOLVING DE-STRUCTURING OF MARITAL ETHICS

Respect for individual freedom is a value of recent origin. Awareness of the value of individual freedom has gone a long way in diluting the traditional structural rigidity by rendering it to an elastic framework that can be bent and stretched without being completely broken or destroyed. This follows a two-stage process. For the metropolitan working woman, this leads first to dual role structures and then a metamorphosed role definition.

There is increasing danger of the marital structure being lost completely and with it, the equilibrium established by the family structure. At this stage, their metamorphosed roles give way to the new roles which apparently bring freedom of expression and the power to redefine traditional ethics. The quest for the surplus self tends to take the metropolitan married woman outside the structure, beyond her routine, acknowledged relationship with her spouse. She looks for a new identity. For her, a new ethical code has yet to emerge.

Towards the closing sections of the *Communist Manifesto* [8], Marx deplored the woman's loss of structural identity in the Capitalist society. The logic of the exploitation of women was sketched by Engels in *The Origin of Family, Private Property and the State* [9]. The insight and wisdom of these writings have become evident in the existential situation of metropolitan women. They are no longer content with the palliative traditional vocabulary of empty evaluative notions. They seem to have come to self-consciousness and refuse to be identified with their roles in the structure. By escaping from the structure, women today are seeking to evolve their potential and further dimensions of creativity beyond it. This is a move, *not* intended to the *contra-structural,* but rather *astructural.* A revision of the entire concept of the relationship between spouses may have to be undertaken, as in Camus' story "The Adulterous Woman" [10]. A novel idea of friendship as a value, irrespective of the structure of marriage, has already taken root in metropolitan society. The nature, implications, and significance of it deserve another study, and there is already a growing literature, novels, and stories around the phenomena of extra-structural affinities and friendships portraying a woman perusing her creative self.

---

[8] Communist Manifesto", Authorised English Translation: Edited & Annotated by Frederick Engels, 1906.
[9] The Origin of Family, Private Property and the State", Frederick Engels. Translated by Ernest Untermann,1902.
[10] The Adulterous Woman", by Albert Camus. A short story written in 1957.

References:

Andal, N., Women and Indian Society: Options and Constraints. -Jaipur: Rawat Publication.2002.

Askham, Janet., Identity and Stability in Marriage. Cambridge, Cambridge University Press. 1984.

Camus, Albert. The Adulterous Woman, Modern Classics Series, Penguin, 1957.

Caraway, James E. Albert Camus and the Ethics of Rebellion., Vol.3, Spain & the Mediterranean,1992, Penn State University Press.

Chanana, Karuna., Socialization Education and Women: explorations in gender identity., ed. –New Delhi: Orient Longman,1988.

Devi, U.L., Status, and Employment of women in India, B. R. Publishing Corporation, Delhi,1982.

Dube, Leela., Palriwal, Rajni., Structures and Strategies: Women work and family., Ed.-New Delhi: Sage Publication,1990.

Forbes, G., Women in Modern India., New Delhi, Foundation Books, 1998.

Gavron, H., The Captive Wife., Harmondsworth, Penguin, 1966.

Kapur, P., Marriage and Working Women in India, Delhi, Vikash Publication, 1970.

Kapur. P., Changing Status of Working Women In India, Delhi, Vikash Publication, 1974.

Meenakshee, J,. Women and new social order., ed.-New Delhi: Omega Publication,2007.

Mies, M., Indian Women and Patriarchy, Concept Publishing Corporation, New Delhi,1980.

Mies, Maria., Indian Women and Patriarchy-Conflicts and Dilemmas of Students and Working Women, New Delhi, Concept Publishing Co.,1980.

Mitra, Narendranath., Golpomala [Garland of Stories], Vol. I & Vol. IV, Ananda Publishers, Kolkata, 1994.

Pathak, Abhijit, Men and Their Paradoxical Feminism. Article published in Mainstream, Volume XXXII, No.7, January 1, 1994.

Ramanamma, A., Graduate Employed Women in an Urban Setting., Poona, Dastane Ramchandra and Co,1979.

Rapoport, R., and Rapoport, R., Dual Career Families Re-examined, London, Martin Robertson, 1976.

Sen, Suddhaseel., Women in Post Independence Bengal: Mahanagar by Narendra Nath Mitra & Satyajit Ray, *Gender and Sexuality in Asia & the Pacific, Issue 22,* October 2009.

Shorter, Edward, London, The Making of Modern Family, Fontana, 1977.

Singh, Mohinder, No sexes please but we're not prudish. Article published in The Telegraph, 29 April, 1993.

Tagore, Rabindranath., SABALA, a poem composed on August 23, 1928 and published in his collection of poems called MAHUA. Visva Bharati.

Tagore, Rabindranath., Chokher Bali, (1902), Bisva Bharati.

Tagore, Rabindranath., STREER PATRA, (1914), Bisva Bharati.

Tagore, Rabindranath., Shesher Kobita, 1929. Bisva Bharati.

Tagore, Rabindranath., LABORATORY, 1940, Bisva Bharati.

Role of Sufis of India for the promotion of Ganga-JamuniCulture

__Dr. Syed Md. Iqbal Shah Alquadri

Abstract:

Ganga-Jamuni culture compares the Hindu-Muslim harmony and friendship to the confluence of India's major rivers - the Ganges and Yamuna. It assumes a peaceful merging of Hindu and Muslim culture and lifestyle in India as expressed in their friendships, joint festivities and interdependence. Sufism has played a pivotal role in shaping the cultural and religious landscape of the Indian subcontinent and promotion of Ganga-Jamuni Culture. The Sufi movement encouraged social equality and brotherhood. Sufis treated Muslims and non-Muslims alike, emphasizing commonalities over differences. The indigenous Sufis fused their practices with local traditions, fostering a unique mystical tradition that advocated religious tolerance and mutual respect. Sufism's legacy in India lies in its promotion of love, unity, humanitarian service, and its lasting influence on the country's cultural and spiritual fabric. Several prominent Sufi saints and orders have left a lasting impact on India's spiritual landscape. Among the famous and prominent sufis of India mention may be made of Shaikh Ali Hujwiri, Khawja Moinuddin Chishti, Baba Farid Ganjshakar, Qutubuddin Bakhtiar Kaki, Nizamuddin Aulia, KhawjaHamiduddinNagori, Shaikh Jalaluddin Sylheti, Khawja Bandanawaz Gesudaraz, Mirza Mazhar Jane Jana, Syed Shah Murshed Ali Alquadri Al Jilani and others. The role of

these sufis for the promotion of Ganga-Jamuni culture in India will be discussed in this article.

India is a land of mysticism and spiritualism. This country had0 always been a fertile soil for the sufisand preachers of different religions. This is the reason this land gave birth to a large number of sufisand sanyasis and attracted a galaxy of religious personalities in every period of history. First of all, themeaning of the word sufi should be understood. There are different interpretations of the Arabic wordsufi, some say it has been derived from the word *suf*means wool some say it is from *safa*means purityand some are of the opinion that it has connection with *Ashab-e-suffa*i.e the companions of the holyProphet of Islam.It has been generally accepted that Sufism (*Tasawwuf*) is basically the Islamicconcept of the realization of God with Holy Quran and tradition of the Holy Prophet of Islam as itsfountain head. The Sufi saint preached that "God is one: One can find God by renouncing everythingexcept loving devotion to God.Sufism is based on the concept of selfless love of God and love forhumanity and service to it. According to a frequently quoted saying ascribed to the Holy Prophet ofIslam (Al KhalqoAyalullah) "all human beings are the family of God". That is why the sufis alwaysemphasizeon universal brotherhood, humanism andreligious tolerance.Theconception of humanityas one nation, despite the diversity of race, colour and language and out stepping all geographicalboundaries is Islam's unique contribution tohuman civilization.The universal outlook is alsoone ofthe basic or salient features of

Sufism and this factor paved the way for the mutual understandingbetweenHinduandMuslimminds.

Sufism in India found an exceptionally congenial ground for its growth and spread, because Sufism, asa moral and spiritual way of life, and as doctrine with universal appeal, found a responsive chord in the Indian mind, for the Indian mind, from the earliest phase of its history, had a strong tendency towardsmysticism.Sufism penetrated intoIndiapriortotheestablishmentof Delhi Sultanate.AftertheMuslim conquest of North India, the Sufis entered into the country and their new ideology spreadacross the country. Dr. Tara Chand says, "The Muslims who came to India made it their own home.They lived surrounded by Hindu people and a state of perennial hostility with them was impossible.Mutual intercourse led their faith differ from what at the beginning they had. Thus, after the first shock of conquest was over, both the Hindus and the Muslims preferred to find out a via media whereby tolive as neighbours. The effort to seek a new life led to the development of a new culture which wasneitherexclusivelyHindunorpurelyMuslim.Itwasinde edaHindu-MuslimCulture."[11]

Even during the times of invasions by Muslim rulers in India all the Sufis, in general, and of thephilosophic school, in particular, maintained with their preaching the mental balance of the differentcommunities. A good number of them made attempts to create friendly feelings by harmonizing the

[11] Dr.Tara Chand,ImpactofIslamonIndianCulture,Allahabad,1946,pg.561

opposing systems. Their friendly and tolerantutterances retained thefavour of both Hindus andMuslims and circulated among the masses in the form of allegorical poems, songs,proverbs andhymns,in the local dialects of Punjab, Sindh, Rajasthan, Kashmir, Bengal, U.P, Bihar and otherprovinces. As tolerance was their motto, they influenced the people's thought and sent the message ofpeace,love,fellowship,understanding,amityandunityto everynookandcorner.

Dr.TaraChandfurthersays"TheHindusofferedsweets atMuslimshrines,consultedtheQuranas anoracle, kept its copies to ward off evil influences, and celebrated Muslim feasts, and the Muslimsresponded withsimilaract.Allthese werethe charismaticinfluenceoftheteachingsofthe Sufis".[12]

The first sufi who introduced Sufism in the Indian subcontinent is Shaikh Abul Hasan bin Usman binAli Hujwiri (1009-1072/77 A.D). The Indian soil which is considered very fertile in terms of religiousthinking and mysticism gladly accepted his ideas. There were a large number of Hindu followersamong his devotees.They firmly believed their own religion but at the same time used to visit the(Khankah)[13] hospice of Shaikh Ali Hujwiri every Thursday to seek his blessings.[14] It provided

---

[12] Dr. Tara Chand,pg.137

[13] A khankah is commonly defined as a hospice, lodge, community center, or dormitory ran by Sufis where religiousteachingsareimparted.

[14] Tasawwufinthe21st Century:FindingsolutionforGlobalCrisis,AIUMB,New Delhi2016,p.352

greatopportunityforcloserinteractionamongdifferentcommunitiesandpavedwayforbetterunderstandingamongthem.

Khawja Moinuddin Chishti (1143-1236 A.D) of Ajmer is regarded as the greatest sufi of India. Hefocused and spread the word that ‘giving is the source of happiness’. His determination began with thethought that no one gets poor after giving but it always multiplies. He believed that one who has strongfaith can never cause harm to humanity. Whoever came to him for help or solution, he would be thehumblest and the kindest towards their miseries. Due to his simplicity and generosity, people world-wide love him.He brought the message of love, peace and generosity. He fulfilled his objectives thatare to bring together the races, communities and castes. He wanted to elevate people from materialisticconcerns, the main reason of devastation today. The essence of his teachings includes firstly, the truefriend of Allah is one who has three qualities. They include the quality of hospitality; one should begenerous like the ocean and one should rise and benefit others in every manner. Secondly, the noblestcharacter is he who has traits of being bountiful, cheerful and friendly. Thirdly, the ways to demolishthe hell punishments include feeding the hungry, helping a person and supporting the aggrieved. Todayhis dargah host millions of devotees who soak in the generosity of his blessings. It was this love andaffection for all of humanity that earned Moinuddin Hasan Chishti the name Khawja Gharib Nawaz orcherisher of the poor. Not only Muslims, but people

belonging to different religions visit this shrinethroughouttheyear.

The sufi and Bhakti movement played an important role in bringing the Hindus and Muslims closer,which paved the way for composite culture and emotional integration. Some great names attached toBhakti movement are Ramananda (d.1472), Kabis Das (d. 1518 A.D), Chaitanya (d.1533 A.D), GuruNanak (d.1538 A.D) and Shankaradeva (d.1568 A.D).Regarding Bhakti movementMohammadYahya Tamizi writes "sufi monotheism appealed to Indian intellectuals who believed in the doctrine*ekamevaadityam brahma*(only Brahma without a second is true)as preached through the sacredbooks of the Hindus, thus a new vista of collaboration between the sufis and the Bhaktas were openedup in this country which helped both to develop their ideology on broad lines."[15] These Bhaktas raisedthemselves above religious consideration of being Hindu or Muslim and condemned sectarianism andcaste.They wiped out communal prejudices and disharmony between the Hindus and the Muslims.

Due to these influences Sufistic and Yogic ideas have been found mixed up in the thought and writings of some Indian sufis. Once few yogis came to the hospice (khankah) of Baba Farid Ganj Shakar (1173-1266 A.D) who was the most famous Khalifa of Khawja Qutubuddin Bakhtiyar Kaki. In course ofdiscussion

---

15

MohammadYahyaTamizi,SufiMovementinEasternIndia,Adara-i-Adabiyat,Delhi, 2009,pg.165-166

with him one of the yogis classified human body into two parts, the upper seat of thespiritual and the lower that of profane aspect of human nature and one was required by the Yogicprincipal to develop truth, benevolence and kindness in the upper part and maintain chastity and purity in the lower. Baba Farid was very impressed to know about this yogic philosophy.[16]

Prof. Nisar Ahmed Farooqi writes same type of incident in the forward of Fuwaidul Fuad[17] that "manyyogis used to come to the hospice (Khankah) of Khawja Nizamuddin Aulia (1238-1325 A.D), the Khalifa of Baba Farid Ganj Shakar. He narrated, once six yogis came and sat for meditation at the door of his Jamat Khana. When he was informed about their arrival, he called them inside his Khankah.Theycameinsideandshowedutmostrespecttothe shaikh.Shaikhtreatedthemwithkindnessandtold them to sit. Thereafter one of them started introducing his fellow yogi saying that he was engaged inmeditation for forty years in the Kanoru hills. In the same way he introduced others one by one and gave details of their spiritual practices. At last, he said that we have been informed through spiritual sources thata great saint (i.e you) have been staying at Delhi so we decided to come here and seek your blessings. Shaikh talked with them very politely and showed great kindness towards

[16]TasawwufandBhakti,ShamimTariq,ArshiaPublication,NewDelhi,2012, pg.22-32

[17]FuwaidulFuadisthediscoursesoffamouschishtisaintofDelhiNizamuddin Aulia

them".[18] All these shows the Sufis and yogis had good cordial relation among them and they used to exchange spiritual ideas and thoughts for better understanding.

During the 11th Century A.D Nagor was the centre of Jain religious saints and savages. At this time a Muslim saint named Khawja Hamiduddin came to Nagor and settled there in 1094 A.D. He gotattached with them so much that he gave up eating non vegetarian food especially red meat. Heinstructed his family members not to distribute non vegetarian food among the poors even after hisdeath. It was only vegetarian food which was permissible for distribution in his Khankah.Even todaythe dargah committee is following the same tradition of preparing purely vegetarian langar because alarge number of visitors to this dargah consist of non-Muslims. Khawja Hamiduddin Nagori is held inhigh esteem by the non-Muslims of Rajasthan. The remnants of his house and madrasah are still maintained by Jain people and itisrespected asasacredplace.[19]

Shaikh Jalaluddin (1271-1346 A.D) of Sylhetis another sufi who won the hearts of millions through his spiritual and charismatic personality. Ibn-i-Batuta, an Arab traveller, who visited Sylhet in the year1340 A.D., has given a vivid account of the Shaikh. He described him as the most venerated person inthe area. According to him "both Muslims and non-Muslims come to visit

[18]HasanSijzi,FuwaidulFuad,Tr.HasanNizami,UrduAcademy,Delhi,2001,pg.150

[19]Tasawwufinthe21stCentury,pg.376

him and bring with them gifts and presents. These offerings are given to the mendicants and travellers who arrive there."[20]

Khawja Banda Nawaz Gesu Daraz (1321-1422 A.D) was a renowned sufi of Chishtia order of hisperiod in Deccan.He learntHindu religion beside Islam and was well acquainted with Sanskritlanguage. Peoplefrom all walks of lifevisitedhis Khankah toseek blessings from him. He was suchan exponent of brotherhood and fraternity that he openly criticized stubborn and orthodox religiouspeople.[21]

During the period of Sikandar Lodhi (b.1458) the sufis of Shuttaria sect settled in India. The founder ofthis sectis Shah Abdullah Shuttari who died four years before Sikandar Lodhi's accession to thethrone. The sufis of this sect developed good relation with the Hindus. A great example of this isShaikh Md Ghous Gwaliori (1500-1562 A.D) who not only tried to study Hindu religion but also madeothers understand the same.[22] He translated a Hindu mystic book Amrit Kund into Persian. It providedMuslims an opportunity to know about Hindu Yogis and their mystical practices. The (Khankah)hospice of Ghous Gwalior was such a place where people from different communities used to

[20]lbn-i-Batuta 'sAccountofBengal,Tr.HarinathDe,Callcutta,p.10.
[21]Tasawwufinthe21st Century,pg.358
[22] Salatin–e-DelhikayMazhabiRujhanat,Prof.K.A.Nizami,1st Ed,Nadwatul Mussannifin,Delhi,1958,p 67

gather. It is said that famous musician Tan Sen was also a great devotee of this saint.[23]

Prince Dara Shikuh (1615-1659 A.D) was a follower of Sufism unlike his brother Emperor Aurangzebwho was a very orthodox Muslim. Dara Shikuh gave himself up the task of acquiring knowledge aboutthe religion and philosophy of the Hindus, andfor this purpose, he not only read and translatedSanskrit books into Persian but also sought the company of Hindu ascetics. The books he translatedinclude the Ramayana, the Gita, the Upanishads, and Yogavashita. The Upanishads were translatedunder the title Sirr-i-Akbar,or the GreatMystery.He calls the collection of the Upanishads the"earliest of the heavenly books" and the "spring of monotheistic streams".[24] He also wrote MajmaulBahrain 'the mingling of the two oceans' to show that between Hindu and Muslim mysticism thereexists only verbal differences. The said work has been published by the Asiatic Society of Bengal. Thetranslator in his preface says" it is the last original work of Dara Shikuh and according to one authorityitwasthisveryworkwhichbroughtabouthisdeath. Itissaidthatthisbookwaslaidbeforethe

clerics who declared its author a heretic and sentenced him to death, which was faithfully carriedoutbyhis over-zealousbrotherAurangzeb."[25]

---

[23]Tasawwuf inthe21stCentury,pg358

[24]MajmaulBahrain'Theminglingofthetwooceans'PriceMuhammadDaraShikuh,Tr.M.MahfuzulHaq,AsiaticSocietyofBengal,1929pg12-14

[25]MajmaulBahrain,pg.30

Shamsuddin Habibullah commonly known as Mirza Mazhar Jane Janan (1698-1781) was a celebratedsufi of Naqshbandia Order in the eighteenth century. Mirza Jane Janan used to teach his disciples toestablish cordial. relations with the people of other religions by setting his own example before them.For instance, he wrote to one of his disciples in response to the query that the latter had made regardingthe Hindu religion. Mirza took it as an opportunity, not only for explaining the tenets of Hinduism, butalso for pointing out some similarities between the belief and practices of the Hindus and those of theMuslims, with a view to bringing both the communities closer to each other. As the letter, which is along one appears to be a sincere attempt to elucidate the religiousideology ofthe Hindusfrom asufistic angle,itdeserves to be discussed.Mirza says "You should know that itappears from theancient books of the Indians that the Divine Mercy, in the beginning of the creation of human species,sent a book named Bed (Ved) which is in four parts, in order to regulate the duties of this as well as thenext world, containing the news of the past and future, through an angel or divine spirit by the name ofBrahma, who is omnipotent and outside the creation of the universe."The codification of religiouslaws, derived from the Vedas,Mirza further says, is known as Dharm Shastar, which he compares tothe *'Ilm-i-Kalam* of the Muslims, and in the same way the division of duties among the four sections ofthe people is called Karm Shastar, which he again compares to the *'Ilm-i-Fiqh* of the Muslims.[26]Fromthe above quotation, it may

[26]AbdulWali,HinduismAccordingtoMuslimSufis,JournaloftheAsiatic

be said that Mirza Mazhar Jane Janan represented those sufis who workedfor the cause of unity, peace and harmony in medieval India through the medium of their writing,which, though belonging to the past, deserve to be highlighted in the present, to ensure a brighter andmore prosperous futureforthecountry.

Syed Shah MurshedAli Alquadri Al-Jilani (1852-1901) was a venerated sufi of QuadriasectofBengal.Popularly known as 'Moula Pak', the saint Urs is one of the most auspicious occasions for both,Indians especially those living in West Bengal as well as Bangladeshis. People irrespective of theirclass,creedandreligioncometoattendtheholy commemorationof thissaintathisshrineatMidnapore town.'Moula Pak' was one among those Sufi saints who have for long propagated themessage of peace and harmony, and even today his teachings continue to bind people together nomatter which faith or community they belong to. There are numerous incidents of his life which can beproduced as example of communal harmony. One such incident is mentioned here. Once there was areligious festival at his Khankah. The in-charge of khankah prepared some food as *Tabarruk* (prashad)[27]for disciples who were present there. When the food was ready, one of the attendants of Khankahstarted distributing the same. In the meantime, a poor Hindu lady who happened to be a sweeper,

---

SocietyofBengal,Calcutta,Vol19,1923,pg246

[27]It is a food distributed at the Khankah of a pir. It is taken by the people as a token of sacredness granting futureprospectus.

sawthat food is being distributed. She was eagerly waiting for some food at the gate of Khankah. But theattendant neglected her and did not give her anything. When Moula Pak came to know this, he scoldedthe attendant and asked the reason for not giving her food. He replied that she is a non-believer, howcanthisholymealbegiventoher.Thesaintreplied "shemaybelongtoadifferentcommunitybutshe is also a human being. You should respect a human being. Give her food in the same proportion as youhave given to others".All these examples bear testimony thatthe Sufis played vital roles in bringingthe hearts of both the communities closer and inspired them with a deep and abiding feeling of humanlove andsympathy.

Thus, it can be concluded that the sufis of India maintained communal harmony and infused a spirit ofsolidarity amongst the different communities and bestowed a remarkable legacy for posterity. It is amatter of greatconcernthatexistingpoliticalandsocialscenarioof India present sapicture of communal disharmony. At this situation the services rendered by the Muslim sufis and Bhakti saintsshould be revived andtheirteachings should be propagated in order tore-infuse the feelings of communal harmony and brotherhood among the countrymen.

The Toxic War of the Fan Clubs at theDigital Spaces: Analysing Abusive Sub-Culture in Indian Cinema

__Roudrajjal Dasgupta

Abstract:

Fan cultures or fan activities have been an integral part in the domain of popular culture in the respect of music, sports, glamour world, entertainment industries or movies. With the proliferation in the advancements of the social media, fandom has taken a huge leap of faith in the 21st century in terms of various fan pages, clubs, and channels at the virtual spheres (X, Instagram, Facebook) by crossing the boundaries of non-digital spaces; and especially when it comes to Indian cinemas, fan cultures in the virtual arena have witnessed rainbows of activities comprising the activities of several fans clubbed together for their respective movie superstars to promote various arts and information to establish the stardom of that particular star. But, the conflicts in the fan cultures in Indian cinemas can be witnessed when the fan clubs of various superstars perform toxic and abusive activities on virtual media to demean each other's respective idols by eliminating the positive fandom practices, for example the fans wars between the Sharukh Khan and Salman Khan fans club after the Diwali 2023 release of latter's Tiger 3, and Vijay and Ajith fans club after the formers release of Leo or the Sharukh and Pravash fans club for the Christmas 2023 release clash, Dunki and Salaar could be observed on digital spaces. This paper attempts to throw light on

how the different fan clubs of superstars in Indian cinemas get themselves engaged in virtual toxic trolling and also how the activities of the fans at the digital spaces through digital abuse, humiliations, and spreading negativities and hatred towards the stars is creating a conflict culture instead of a healthy structural correlation, and raising a sensational toxic fanatic war.

Keywords: Conflict culture, Fan Clubs, Fan Cultures, Indian cinemas, Popular culture, Toxic fanatic war.

"A fan club is a group of people who tell an actor he's not alone in the way he feels about himself" – Kenneth Williams

Introduction:

The last leg of December 2023 witnessed one of the biggest movie clashes of Indian Cinema till date, when the King of Bollywood, Sharukh Khan's movie 'Dunki' clashed with the 'Bahubali' movie fame Rebel Star or the Darling Prabhas's movie 'Salaar' within a gap of one day. Superstar SRK and famed director Rajkumar Hirani's movie Dunki released on 21st December, while Superstar Prabhas's and Kgf movie fame director Prasanth Neel's movie Salaar hit the theatres on 22nd of December in Pan India and Pan World level. And this very clash, one from the Hindi belt and another from the South belt heated up the war among the fans of both the superstars across the global social media.

Social media went berserk when the fan clubs of both Srk and Prabhas started to troll each other's star in the most nasty and vile way in recent times. Several

posts on the X platform were seen, where the fans by using hashtags used abusive kind of trolling by crossing all the limitations of healthy trolls. #LotteryStarPrabhas vs #DinosaurCrushedDonkey went viral and were the talk of the country among the fan bases of both the stars. Fans of both the stars even photoshopped and morphed each other's pictures and faces and tried to humiliate in whatever possible way across the social media. (https://www.india.com/entertainment/salaar-vs-dunki-prashanth-neel-on-social-media-war-between-srk-and-prabhas-film-not-here-to-compete6622024-6622024/)

Fans and Fan Cultures:

Fan Clubs and Fan activities are a great and strong part of the Popular Culture genre. Various activities of the fan club members, whether in respect to sports, music, and movies always grabs the attraction of the masses. The fan clubs or members basically spread the identity of their favourite stars in a much larger way. And when the fan activities come to cinema, especially in Indian Cinema, it somehow reveals up in a much grander structure.

Fan culture can be said as a Participatory culture or Subculture comprises with individuals (Fans) by a fervid feeling of connectedness on a common interest. It's also a part of mass culture and Media culture and plays a strong role in the popular cultural context (Harris, 2017). The fan is basically the point of convergence between the audience on the one hand and the film star on the other (Srinivas S.V. 2021).

Fan cultures or fan activities in Indian Cinema can be traced back first in the regional industries like

Tamil and Telugu with the advent of MGR and NTR respectively, and later helped them to structure their political discourses in their respective states. But in the Hindi belt, especially in Bollywood, with the emergence of the Amitabh Bachchan era, fan cultures in Indian cinemas took new narratives. With the advent of the global super-stardom of Mr.Bachchan, the concept of fan clubs and their activities reached the global stage. Several fan clubs of Bachchan across India, and beyond India emerged during the late 1970s. In the south simultaneously, the super stardom of Rajnikanth started to spread globally in the mid-1980s.

Since the 90s, with the emergence of so many superstars at the same time, several fan clubs and their campaigns for their respected stars started to normalise with the modern culture. From the Telugu zone, fan clubs of Cheeranjivi and Nagarjuna got much popularity; the Bollywood zone had seen the fan clubs emergence of Sharukh Khan, Salman Khan, Akshay Kumar, Ajay Devgn to reach a great height.

The Fan Wars:

Before the advent of the social media, fan clubs of one particular star and their tussle with the other star fan clubs were seen outside the theatre halls with mass celebrations and campaigns. Fan clubs of different Superstars during their favourite stars movie release used to compete with the other clubs by making the release celebration in a larger than life way. The clubs used to wait when their favourite stars movie would release and they would be going to celebrate in a mind-blowing way so that they would be able to prove to the other stars fan clubs that their star is the best in the world.

Sometimes strife could be witnessed among the fans club both in and outside the movie halls, especially in the case of the commercial movies, mostly during the release of two hero's movies. I.e. during the release of the Hindi movie Mohra (1994) starring Akshay Kumar and Sunil Shetty as the lead, there were both healthy and heated fights among the fan clubs of both Akshay Kumar and Sunil Shetty. During the release of the movie Dil Toh Pagal Hai (1997) starring Shahrukh Khan as the lead, heated fights broke out between Sharukh Khan and Akshay Kumar fans at several theatres as Akshay had an extended cameo in the movie, and the title track of the movie featured Akshay along with Madhuri Dixit (the female lead of the movie), instead of Sharukh and Madhuri.

In between several differences among the different star fan clubs in Indian Cinema, still during those eras there was somehow a healthy environment in the fan cultures and activities and campaigns. There was a sign of mutual respect for each other among the clubs, and in many instances they conjoined together. I.e. during the jail term of superstar Sanjay Dutt in the 90s, several fan clubs of several other stars unanimously campaigned for the release of Dutt.

Fan Wars at Social Media:

The wide spreading of virtual media along with the technological advancements has shifted the very essence of the fan cultures of Indian movie Superstars at a far level height. Through several social media platforms, like X, Facebook, Instagram, there are many fan clubs pages of different Superstars. These fan pages basically execute the campaigns for their favourite stars

and their movies updates and even their stars message through the sphere of virtual media. 24 × 7 these fan clubs are active at the social media and every minute they are keeping the buzz high through several information regarding their demi-god star. Even these pages come up with several fan arts, fan information, fan stories, fan-fiction and many creative stuffs related to their favourite stars.

But things turn toxic when several fan clubs engage in fights with each other over social media, and they utilise abusive words to demean each other's stars. Words, memes, slangs, morphed pics are their tools to humiliate their other stars on social media. The entire social media irrespective of the platform become a virtual battlefield when it comes to abusive trolling.

In 2019, December, Salman Khan's 'Dabangg 3' and Akshay Kumar's 'Good Newwz' released within a span of one week, and both the Superstars fan clubs did engage themselves in freaking fan war over social media by using hashtags and even the dispute went to the stars respective religion, #SalmanHateHindus vs #AkshayInsultsLordRam.

November 2019 also witnessed a strange fans war on X, between Tamil Nadu Superstars Thalapathy Vijay and Thala Ajith fan clubs, when one fine morning #RemoveBraOfActorVijay vs #RemoveSareeofActorAjith did trend in national level.

Even when Superstar Akshay Kumar interviewed our Prime Minister Narendra Modi in 2019, several fan clubs of Superstars Salman Khan, Sharukh Khan, trolled

Akshay Kumar on social media by using #BootLickerAkshay.

Last year, in September 2023, when Sharukh Khan's movie Jawan opened with a huge box office number, Sharukh fan clubs started to trolls Akshay Kumar over social media, #2CrOpenerSethji as Akshay's movie 'Selfiee' (2023) opened with an approx 2.5 crores in the first day collection.

In October, 2023, Superstar Vijay faced huge trolling from Ajith fan clubs when Vijay's movie 'Leo' hit the theatres. There was a sequence of one Hyena in the movie, and Ajith fans club morphed the picture with Vijay's face and trolled him in a vulgar way over social media.

The Diwali 2023, saw one of the nastiest fans wars over social media again, when Superstar Salman Khan's Tiger 3 got released and flopped at the box office. Sharukh Khan fan clubs trolled down heavily as the movie failed to beat the box office records of the movie 'Pathan' (2023) starring Shahrukh Khan, which is also a part of the same universe. Vile words, abusive languages, and even cheap trolling went on over a month between the two stars Clubs.

The South vs North Debate:

The very recent controversy on the social media went hysterical and brought the South vs North cinema debate in the forefront, when Bollywood actor Arshad Warsi in a podcast interview, criticized Superstar Prabhas for his role in the movie "Kalki 2898 AD", and stated that director Nag Ashwin presented Prabhas in such a way in the very movie that he looked like a joker. The

fans of Prabhas got huge ire and attacked Arshad Warsi over social media. The controversy pumped more heat, when Telugu Natural Star Nani, attacked Arshad in the defence of Prabhas. Though Nani apologized to Arshad Warsi later. The director himself mediated the issue by requested fans not to divide the south and north film industries (as one of the fans shared a particular clip from Kalki 2898 AD mentioning the particular scene was greater than the whole of Bollywood), and to stop making it a Telugu vs Bollywood industry war. And also urged for a #United_Indian_Film_Industry. Nag Ashwin said that Arshad could choose his words better and also said that he would work hard to present Prabhas in a better way in the sequel, so that Arshad likes and feels Prabhas has done a good job.

The South vs North debate also came into limelight in 2022, when Bollywood superstar Ajay Devgn commented, Hindi as the national language, and Kannada superstar Kichcha Sudeepa refuted that. Their respective fans and fan clubs took social media on storm by attacking each other and igniting the South vs North debate. Later, both Devgn and Sudeepa cleared the conflict and stated as misinterpretations.

Does Fan Wars over Digital Spaces head towards a Toxic Sensational Culture?

For a couple of years, the trend of abusive sub-culture across the digital media is an everyday story. Especially in the zone of the fans clubs of Indian Cinemas, the war of the fan clubs are crossing every boundary of the societal decorum. Nowadays these fans are on social spaces attacking each other's stars on the basis of religion, political ideologies, personal choices,

and so on. For instance, due to the political ideology of Superstar Pawan Kalyan, director Ram Gopal Varma always attacks him over social media directly, which basically boosts up the fans of both Pawan and Varma to humiliate and defame each other most violently through various abusive words. Recently the direct social media confrontations of Pawan Kalyan with the Chief Minister of Andhra Pradesh Jagmohan Reddy, helped their respective fan clubs to engage in vulgar activities against each other over social media. (https://www.indiatoday.in/movies/standpoint/story/rajini-kamal-vijay-ajith-fight-pawan-kalyan-jr-ntr-mahesh-babu-controversy-337340-2016-08-26)

The religious affiliation of the respected stars sometimes brings vile kind of abuses on social media among the fan clubs. Few fan clubs of different stars on X or Facebook having similar interests lend support to each other and form a coalition against the other stars. A few times back fan clubs of Akshay Kumar, Ajay Devgn, and Hrithik Roshan attacked the fan clubs of Sharukh Khan, Salman Khan and Aamir Khan over the social media, i.e. #HinduSuperstars vs #IslamicStars.

The trend of fan wars goes too extreme and personal and hampers and creates a dark negativity over social media. The personal dispute of actor Hrithik Roshan and actress Kangna Ranaut went cheaper due to the involvement of the fan clubs of both the stars.

Superstar Akshay Kumar faced similar kinds of personal attacks when he applied for an Indian passport as he took a Canadian passport once. #CanadianChakki went viral and ignited by the few fan clubs of other stars.

Even Akshay Kumar and Sharukh Khan fan clubs attack Ajay Devgn over his advertisements on Vimal Pan Masala, #VimalStarAjay or #GutkhaStar.

The war on Prabhas fan clubs vs Allu Arjun fan clubs, or Mahesh Babu fan clubs vs Pawan Kalyan fan clubs or other fan clubs trends in a nasty way almost everyday.

The fan clubs do not even spare the film reviewers or critics on social media. If any very critics do give negative reviews of their favourite stars movie, they use to troll the reviewers vulgarly and even report in a mass way to block his respective channels at digital spaces. I.e. the recent online abusive attacks on movie Youtuber Bobby Bhai by the fan clubs of Sharukh Khan, Salman Khan and Hrithik Roshan, when Bobby Bhai criticized the movie Pathan, Tiger 3 and Fighter respectively. Film reviewer Suraj Kumar also faced a similar situation recently when Akshay Kumar fan clubs did mass report on Suraj Kumar channel as the latter gave negative reviews regarding the Eid 2024 release of Akshay Kumar and Tiger Shroff starrer Bade Miyan Chhotey Miyan.

Methodology:

The paper draw Methodology based on secondary data from the internet and content analysis on various fan clubs and movie reviews pages across the larger sphere of social media platforms like X, Facebook, Instagram, and YouTube.

Conclusion:

The discussions of the paper obviously clear the fact, that fan cultures in Indian cinemas have turned a great upside down with the advancements of the social media, and the trend of creativity in fan cultures has taken the form of abusive sub-cultures over the digital spaces. The popular culture of course does not accept these activities of the fans, but somehow the increasing trend of toxic fandom behaviours and activities hurting the essence of fandom genres badly. Superstars like Salman Khan, Sharukh khan, Prabhas, Yash, Ajith, time and again spoke against these toxic fans activities and requested their fans and fan clubs to stop their war over social media. All the stars hold a good camaraderie between themselves and maintain a mutual respect for each other, but this kind of abusive and toxic war of the fan clubs at the digital spheres leaves a negative impact and somehow hinders the healthy creative activities of the fan clubs.

References:

Books and Articles:

1. Adorno, Theodor. 1991. The Culture Industry, London and New York, Routledge.
2. Colton David, Covert W Robert. 2007. Designing And Constructing Instruments For Social Research And Evaluation, John Wiley and Sons, Inc.
3. Dr.Srinivas S.V. 2021. Fan. Sage 12 (1-2) 83-86.

4. Fiske, John. 1992. 'The Cultural Economy of Fandom, The Adoring Audience: Fan Culture and Popular Media', London and New York, Routledge, pp.30-49

5. Hills, Matt. 2002. Fan Cultures, London and New York, Routledge.

6. McLuhan, Marshall. 1964. Understanding Media: The Extensions of Man, McGraw-Hill.

Google Links and You Tube:

1. https://www.moviecrow.com/News/24885/toxic-fan-culture-peaks-in-kollywood
2. https://www.firstpost.com/entertainment/has-toxic-fandom-morphed-from-fantastical-to-dangerous-fanaticism-for-anushka-sharma-11554691.html
3. https://indianexpress.com/article/entertainment/tamil/the-curious-case-of-toxic-fandom-of-tamil-cinema-8418679/
4. https://www.indiatoday.in/movies/standpoint/story/rajini-kamal-vijay-ajith-fight-pawan-kalyan-jr-ntr-mahesh-babu-controversy-337340-2016-08-26
5. https://www.siasat.com/watch-huge-fight-breaks-out-between-salman-khan-and-srk-fans-2701076/
6. https://www.thequint.com/news/hot-news/srk-versus-salman-khan-fan-wars-upsets-shah-rukh-khan
7. https://www.ndtv.com/entertainment/salman-khan-threatens-to-quit-twitter-if-fans-dont-stop-trolling-shah-rukh-aamir-770292

8. https://www.ndtv.com/entertainment/feels-good-that-our-fans-love-it-salman-khan-on-him-srk-doing-cameos-in-each-others-films-4601719
9. https://www.ibtimes.co.in/jawan-vs-salaar-srk-prabhas-fans-wage-virtual-war-social-media-amid-box-office-clash-details-860684
10. https://timesofindia.indiatimes.com/entertainment/hindi/bollywood/news/filmmaker-prashanth-neel-urges-respect-for-shah-rukh-khan-and-prabhas-amidst-nasty-dunki-vs-salaar-clash/articleshow/106403948.cms?from=mdr
11. https://www.india.com/entertainment/salaar-vs-dunki-prashanth-neel-on-social-media-war-between-srk-and-prabhas-film-not-here-to-compete6622024-6622024/
12. https://www.dnaindia.com/entertainment/report-prashanth-neel-reacts-to-ugly-social-media-war-between-prabhas-salaar-shah-rukh-khan-dunki-3073076
13. https://www.hindustantimes.com/entertainment/telugu-cinema/prabhas-shah-rukh-khan-salaar-dunki-war-nasty-box-office-prashanth-neel-101703923133472.html
14. https://www.news18.com/opinion/opinion-salaar-vs-dunki-why-the-clash-of-titans-has-led-to-an-ugly-fan-war-8722864.html
15. https://www.socialnews.xyz/2023/09/30/prabhas-and-shah-rukh-khan-fans-war-in-social-media-video/
16. https://chennaimemes.in/leading-actress-reacts-on-the-disgraceful-hashtags-of-tamil-fans/

17. https://www.indiatoday.in/movies/gossip/story/hrithik-roshan-kangana-ranaut-fight-sussanne-khan-rangoli-1060611-2017-10-09
18. https://m.tellychakkar.com/movie/movie-news/shocking-ajay-devgn-gets-trolled-over-his-latest-video-netizens-are-saying-he-high
19. https://www.news18.com/viral/akshay-kumar-ditching-canadian-citizenship-for-india-invites-more-trolling-twitter-reactions-8537710.html
20. https://www.brainyquote.com/quotes/kenneth_williams_186963
21. https://www.republicworld.com/entertainment/bollywood/prabhas-vs-arshad-warsi-munna-bhai-actor-takes-a-step-to-shield-family-from-trolling#google_vignette
22. https://www.thehindu.com/entertainment/movies/arshad-warsis-joker-comment-on-prabhas-role-in-kalki-2898-ad-director-nag-ashwin-reacts/article68561649.ece
23. https://www.thequint.com/entertainment/celebrities/kannada-actor-kiccha-sudeep-on-ajay-devgn-twitter-hindi-national-language-debate
24. Bobby Bhai The Matinee Idol Channel
25. Bollywood Premee
26. Bollywoodwallah
27. Suraj Kumar Review Channel

The Return

__*Translated by:* Dr. Debaprsad Bannerjee

Abstract:

I am privileged to present here the autobiographical reminiscences of Jayanta Mahapatra. This is based on a conversation with him a few years ago before his demise. It depicts the poet's childhood and adolescence.

When I sat down to write in a room of Tinkonia Bagicha – I felt my heart wasn't there – it was somewhere else in some other place. I listened to these words which I had been listening to since my childhood days, but never had seen – where did they hide? I do not know! – in some womb. They come out and expand from the depths of love. They expand rapidly and spread out in an endeavour to encircle these words four and five times. That childhood heart isn't with me – maybe there are echoes.

I felt my father's heart was with him in his palm. At least for me, whenever I had been for a walk my four - five years old palm felt that my father's heartbeats were with him in his palm. My truant mind told me that. I recalled that immersion day - when my father and I had set out for Chandichawk more Durga idol from our hostel quarter near Kathajodi river. All idols were arranged in a row. And what sound of music. It seemed that entire Kathajodi River throbbed with the ecstasy and

exhilaration of music. I was beside myself with joy. It danced in my front of the idol.

I spent my childhood days near Kathajodi River. My father was hostel superintendent there. I remember Baidyanath Misra was the asst. hostel superintendent there – it was meant for the boys of Ravenshaw Collegiate school. The water and air of Kathajodi had a unique transforming power in daylight – there was nothing great about its shadows – it takes one to endless delight – I take to Cross those doors. My father's quarter was on the top floor. My father, mother and I stayed there. My younger brother was born after four years but I was most favoured by my father. I used to go out with my father and I felt so proud.

I felt, as if I was touching the sky. Hostel boys loved me very much, Sri Ram Chandra Das and Sri Gokulaananda Kanungo here amongst them. They are now well-known Industrialists. They used to lift me to their room. They were nearly fifteen and sixteen at that time.

The main door of our hostel opened to the precincts of a mandir temple). The ups and downs of my life chimed in with the temple bells -- as if, a deep bonding of my relationship. something that touches me and goes far away. And I plunge into dreams of my boyhood days. Those mysterious moments made me lovely or gave me unknown feel or something else I do not know. I can't say now even if I think deeply.

I spent five boyhood years near river Kathajodi I did not know the difference between living and dying. An

un known sense of fear gripped me – without any reason. I face still a situation when was four years old.

I do not remember the day but it would be 1932 or 33. I usually remember the noon incident. I was with my brother and mother in our quarter. I do not remember what I was doing but I still remember my mother was on the lead with my brother. My brother was six months old It was no more noon that time it was 1:30 or 2 p.m. Time stood still. A loud sound unimaginable floating around. There was not a speck of cloud in the sky. I could not understand anything, suddenly listened to the footsteps of my father. My mother looked at me with a strange expression, within moments my father entered the room and ran away picking me up. Straightway he ran through the main door to the open field near the temple. He made me sit on the grass and reentered the house cannot still forget that days.

The most affected state was Bihar. Many persons were homeless and houses damaged. The fear that crept in remained with me forever.

Orissa did not witness such a disaster. I was very safe and sound in my home. But still today I cannot forget the deep affection of my father for me. It happened almost seventy-five years ago. I visualise how my father appeared on a Pegasus did take me away to a safe place.

Today I think my father loved me most and not my younger brother. I have spent my time in light and sometimes in darkness. I have spent my life through that time. I feel sad but I feel happy. My father's love for me was of a different kind. If I have even become somewhat of a good man, it is because of my father. I have never

seen my father's shadow. Other persons' shadows have encircled me I feel.

Those days were lost like dreams, like autumn clouds in the sky. I could not come out of the clutches of the shops of Tinkonia Bagicha. Everything has changed right form the streets. Those handdrawn rickshaws are not there, those roads covered with brick dust are no more. That big Aswatha tree. People do not come during puja for idol immersion. Tazia of Muharram, Baghbahadur dances are no more. Those roads where I had gone with my father are there. But somethings are missing. Those eyes of a little girl, who was also watching with her father like me. And she was surprised.

Life is in death. I know this much. In real terms there is no much thing as birth or death, no future no past.

In life I want nearness of a person – whose absence takes away something, if he is present or absent life changes in his absence. Even pegs were into the coffin of my grandfather my father's unbearable crying touched my heart. I didn't know that an adult could cry like that.

I did not cry when my father died, not even when my mother died. Today I think did not I love them? My eyes are not there like the floating clouds in the sky. Clouds float away – they come from far but do not stay – they do not weep. Those eyes mock at me. Then why those eyes? They do not have any function, not a tear drops. These two eyes do not see the world in spite of looking at them. The world seems lost. My life, my

childhood is lost. It takes my heart and runs away to a poisonous darkness.

I remember today my father's cry. It was a child's cry.

As if, someone had snatched a toy from his hand. I can't forget that – his sudden face. Then I think why should I forget? Everything got mixed up – that cry, love, appearance since, I concern Not only he but others too. So many colourful eyes. So much wastage, so many prayers, so many regrets, so many words – mixing up all these I have made up this cell – inside there I have remained as a seed, being none other than Jayanta Mahapatra. I recall that – hunger of my grandfather. I could not comprehend that hunger. I feel like touching someone else's broken wall. To be drenched in the seeping water of someone else's roof, feel like spending sometimes giving money to the mother of the five-year-old girl who thrives on selling her body. I do not know why. I like all these. I have spent eighty-one years of my life carrying the dead body of hunger. How many days more?

Our small family spend five or six years by the side of Kathajodi river in the government hostel. The building was adjacent to the Muslim Seminary. Then Cuttack was a big village. Our house was in a circle of the road. Muslim And Harijan slums were on the other side of the road. At time a quarrel broke out on any pretext. People used to throw bricks taking them from our wall. Police intervened. Next day everything became normal. There was no electrical wire on the road. Everyday a person used light lamp carrying a ladder and kerosene lamp. The evening turned out to be the insulted

fall of the light below the wooden post. The insults of my school days started weighting fairly on my mind. It is a different kind of darkness. It was difficult to get rid of the feeling.

Darkness of the mind never moves. It remains there all the time. It becomes visible when you want to avoid. I read in Stewart school. I could not stand side by side with the rich men's sons. I was also youngest in my class. To save myself from the thoughts of my classmates I withdrew into the dream world, which I sought in books. I used to go near the pond with English story book in my hand during tiffin hours. I learnt many things out of those books. I learnt how to escape. How to enjoy different seasons – mountains-rivers -fountains – their languages I learnt how to seek eternity through words. Realizes how these words can make one naked.

I returned home after school. The water of Kathajodi river sent ripples through the trees of Deodar surroundings in my new house. I did not see the reflection of light in my father's eyes.

My father got transferred in different parts of Odisha being the sub-Inspector of schools. He used to inspect primary schools. My mother, brother and myself remained at home. Father started staying away from home – in Ganjam, Purusottampur and Rourkella. In every two months he used to come home twice. The sole responsibility of the house was on me, so far, I remember my mother was not fit. Apart from my study. I used to help mother in domestic chores.

I used to perform many tasks in keeping with my age, was hardly eleven when the second world war

started. As a conservancy after evening, we started reading or doing other works covering the lantern with paper. There was scarcity of food, wheat and sugar were not available. We used to have pancake made of 'Biulidal'. At times my father used to bring ghee used to enjoy rice, daal, ghee with kagzi.

I need to feel emptiness at home. My mother now to look down upon me always – I need to feel suffocated under those stern eyes. My mother used to curse me on the slightest pretext. She used to complain to my father when he returned home. I do not instead to ... all her tasks … collect ... when my mother was sick are used to cook and at times brought back the cow home when it was lost ……. There was no time for reading book. Only before going to sleep, I used to stare facing the wall and dreamt of transforming myself ... a handful of dust. Dreamt of flying away. Thought of remaining as dust in the affection al garden full of flowers.

My affairs with the air started so long back in my childhood – my life is full of his touches yes, I have not seen him but his touches have changed my mind, sometimes in deep sorrow and sometimes in deep meditation. He attracts me with his unknown and inexplicable qualities. It gives me a new basis of life. He is chiding like frenzy. Is God like him? Could be.

Still this day I cannot understand God and air. He was like a window and I was surrounded by dark walls. I looked through the window many happy moments and felt joyous.

I celebrated my life through air. I spent my boyhood days beside Kathajodi river. My father was the

hostel super intendent of Kathajodi I remember Baidyanath Misra was the Asst. hostel superintendent – there was hotel for the boys of Ravenshaw Collegiate school. The water and air of Kathajodi used change in the sunlight and in that light, there is no dark shadow, only unending larges at happiness and I love to cross every layer. On the top floor of the hostel was my father's quarter. My parent and myself used to stay there. My younger brother was born after three, four years but was my father's most favourite. Whenever I used to go out with my father. I felt proud. I felt, as if. I touched the sky.

Hostel boys used to love me very much. Amongst them was Sri Ram Chandra and Sri Gokulaananda kungngo (famous Industrialist). They used to take me to their room. They were hardly fifteen or sixteen years of age. Adjacent to the main door of our hostel was the area of a temple. The ups and downs of my life used to chime with the tolling of temple fell – as if a very deep bonding sometimes used to touch and moved off. I used to roam about the dreams of my childhood. These mysterious moments brought in a sense of loneliness or unknown pain or anything else? I won't be able to say even if I think too much.

I spent five years of my life here. I did not know and dying, unknown sense of fear at times permeates my life. I faced such a situation when I was four years old. I do not remember the exact day. But it was either 1932 or 1933. The memory of that day's happening is very vague we were there with my mother and brother in the quarter. I don't remember what was doing. My mother sat with my brother on the bed. My brother was six years old then

suddenly after noon was no longer afternoon. It was two O' clock. Suddenly uncanny sound moved in from far. There was not a speck of cloud in the sky. I heard my father's footsteps. My mother stared at me. My brother was there. In a second my father entered and took me away to the arena of the temple. Then he entered into the quarter. I have not forgotten that day of earthquake.

The epicentre of the earthquake was in Bihar. Many houses were damaged and many persons were affected. That fear psychosis has remained ingrained in me. In Odisha there was no such damage. We were in our homes without any disturbance.

I haven't forgotten my father's love for me. It was almost seventy-five years ago. How my father came fast into a Pegasus and carried me away. He loved me most. I spent my time in light and shade.

I spent my life through that unknown phase. I feel sad but I derive pleasure too. My father – his love was of a different nature to me. T have become good to some extent it was because of my father. I have never seen my father's shadow.

Those days are gone like dreams like clouds in an autumn sky. I could not come out of the confines of shops in Tinkonia Bagicha. Everything has changed right from the roads, those hand drawn rickshaws are not there, those roads full of 'moram and surki' are not there. That big Aswatha is not there. People moving wearing around to carry idols during Puja are not seen. Muharram's Tajia or Dance of Baghbahadur are not there. That scene during intermission of idols I need to watch with my father. But something is missing now. That little

girl watching with her father the same scene with an expectant eye – there. I wish now.

Life in death. I know the much. In real terms there is no such things as life and death, no future, no past.

In life desire to get someone's proximity – his absence makes me feel that I have lost something. That absence has transformed my life.

In that song there was intimacy but no voice. I learnt to make paper aeroplane. When I need to float aeroplanes my mind remained of lot with them – I didn't remember any bad word-neither my mother's or any upstart friends, sometimes a word eases your discomfort, at times a shall word assurance a greater impact while playing with those aeroplanes one real aeroplane did arrive in Cuttack. Then I was hardly ten or eleven. I was very excited to see that aeroplane. We went to see that when it landed on the ground near the fast. There was a sea of human heads. I could not go near it. But it seemed a big white- sat on the ground. Those days are gone. Now there is Barabati stadium in that ground. The Balijatra ground is not there as before and the stream around the fort is not there. Only that big gate made of stone standing there – alone like a powerless guard. That gate does not listen to the battle cry or the cry of a baby form a far country across the sea. In their surroundings darkness that gate has best its vision.

After Evening morning then again evening. There is no uncertainty about it but my distrust of my mother continued. I do not think that my days at home I spent in merriment. I didn't spend them with my playmates. I only

think whatever happens in childhood – do they have any bearing on one's life afterwards?

I learnt to live like a rat, creating a hole in the sand, covering my face. I wasn't groping for ants was engrossed in my books. I read about so many new lives. I started reading new books in English. I realized that my creative faculty areas spreading out.

In spite of that I did not feel like staying at home. I decided that I would leave home. As I grew older the de sire for going out got intense. I was thirteen then. One night I thought of leaving. I took my trouser and shirt in a small bag. It was raining. Thousands of birds here returning to their nests. The net of darkness that covers the sky. It was a silent night. I didn't have any other question or any answer. I had the intense desire to leave my home. All round my home there was the movement of the shadows of deodar trees. When my mother went to bed it was ten at night. There was only my brother. I went to bed also. I was very tensed as it, the walls were moving. Walls weren't silent too, they moved towards me like the crying bats whose wings were broken. I couldn't close my eyes till midnight, then the days started barking, a bad omen in the distant cry. l got out of my bed but couldn't leave house. A cat nearby started mewing. I was a bit scared. That day stares at me with a strangeness. In my childhood sight there was the light of the bole star, the light that couldn’t reach our world. Another feeling was the desire to love and there was the feeling of not being able to love and I waited in baited breath and stood silent. Without knowing what was happening, within me I listened to the beating of my heart.

Other students of my class frightened me, that I understood how coward I was. My mother came to know about it and I thought that throughout my life I will remain a coward. I feel like that now. I get scared while entering a big shop or a restaurant. I feel like flying away like a dust particle – that day and now also.

I felt like – loving when I was thirteen years of age and enjoyed looking at girls. It was like spreading your hands and touching. But my hands were my hands. The princes away in the cloud and I could not get lost. I think like rivers, grass, birds there is a touch of sadness in the beauty of girl which cannot be seen separate. It permeates their persons. Its indistinguishable. I loved thinking about them, the girls who were in my locality, in the block page of my heart I feel like putting a jewel – of pictures, emotions and attachments.

But out of time's month nothing comes out, but a stability remains, that disturbs me.

Sky means to me an endless void, that makes you thirsty. But in the evening, nothing remains there. A different space is created there and everything in us changes – place and time. Foolish and kind darkness at times comes out in the open without reimaging inside and expresses itself in the form of tear drops, which are showered on the grass and stones. A non-event is transformed into an event.

In such a rainy evening my mind did give in to a ten der attack, maybe I will witness incessant tear drops of my entire life. I was fourteen then, once l came face to face with my cowardice. It was an innocent and silent moment whose impact is old now. But unforgettable.

Suddenly one of my friends entered my room. My mother, brother and my little sister were there. My friend was very excited. He talked to me in a low voice 'Come fast' don't ask me why to the next room. There was a carpenter room next to our house. One girl of our age lived there. They were very poor but very gentle and sober. My mother didn't like them and exhorted us not to mix with them. I didn't like the attitude of my mother.

Bionotes of the Contributors

Dr. Debaprasad Banerjee:

Debaprasad Banerjee is an Associate Professor of English at Government Girls' General Degree College. He has been teaching in different colleges in West Bengal for thirty-eight years. He has obtained a Ph. D. from Calcutta University. His areas of interest include British fiction, poetry and translation Studies.

Dr. Madhumita Sen:

Dr. Madhumita Sen has Retired in 2024 from West Bengal Educational Services as an Associate Professor in Sociology.

During her thirty-six years in undergraduate and postgraduate teaching, she headed the department of Sociology at different Government colleges. With an interest in Cultural studies, she completed three UGC Sponsored Research Projects. She completed research work, as a Teacher Associate, on the issue of the Changing status of women, at the Inter-University Centre for Humanities and Social Sciences, Indian Institute of Advanced Studies, Shimla from 2008 to 2011.

She has published articles in Journals and edited volumes on diverse issues.

Association with the UGC Sponsored program of "Capacity Building of Women Managers in Higher Education", in the past years, remains a place of significance which provided renewed motivations to pursue research and readings on the issues of women and the marginalized.

Dr. Md Mohsin Khan:

Md Mohsin Khan is an Assistant Professor of Urdu at Government Girls' General Degree College, Ekbalpur, Kolkata. He completed B.A (Hons) inUrdu from TDB College Ranigunj (Burdwan University) and M.A from Calcutta University. He has been awarded Ph. D. degree by Patna University in 2014. He joined Purulia Zilla School as an Assistant Master in 2009. After that he was appointed as an Assistant Professor at the Department of Urdu in Hooghly Mohsin College, Hooghly in 2015. In 2022, he was transferred to Government Girls' General Degree College, Ekbalpur, and till now he is working with it. He has taken classes in Kazi Nazrul University as a guest faculty in Urdu Department for two years in 2019 and 2020.

His first article *"Kalam-e-Iqbal mein science basirat"* was published in the International Journal *Roshnai* (pakistan) in 2011. After that his different articles have been published in India in various renowned journals. He presented many research papers in different National Seminars and delivered lectures in different educational institutions on different literary topics.

Dr. Md. Sadrul Islam:

Dr. Md. Sadrul Islam is an Assistant Professor in the department of Arabic, Maulana Azad College, University of Calcutta. He was awarded the Ph.D. degree by the Faculty of Arts, University of Delhi in 2013 on the topic "Contributions of West Bengal to the Arabic Literature and Islamic Studies with special reference to Prof.

A.M.K. Masumi." His research interest area covers Indo-Arabic literary traditions and intellectual history of Islam and Muslims in Bengal. He has a number of books, monographs and research articles to his credit.

Dr. Md. Shahid Jamil:

Dr. Md. Shahid Jamil, Assistant Professor of Persian at Government Girls General Degree College, is known for the quality of his scholarship and teaching. He completed his Honours and Master's degrees in Persian from Calcutta University and visited the Islamic Republic of Iran in 1997, where he completed a certificate course in Familiarization and Advancement in Modern Persian Language and Literature in Tehran. In 2018, he was awarded a Ph.D. from Calcutta University with his thesis titled "The Life and Contributions of Ubaidullah UbaidiSohrawardy." Dr. Jamil has participated in numerous national and international seminars, symposia, and refresher courses in both India and Iran.

Dr. Nakhat Parween:

Dr. Nakhat Parween has completed her graduation and post-graduation from Hooghly Mohsin College. After that she obtained her doctorate in Urdu from Burdwan University and qualified NET and SET examinations.

She has presented papers in national and international seminars and her articles have been published in various magazines, journals and books. She worked at MANUU centre as counsellor, at Laal Baba college as a visiting faculty and gave lecture series at Government Girls' General Degree College, Eqbalpur.

She is currently a guest faculty at Kazi Nazrul University in Asansol. Dr. Nakhat Parween can be reached at Contact No. 8444033375 and Email: nakhatparween@gmail.com

Dr. Raza Mazhar Ansari:

Dr. Raza Mazhar Ansari is a Guest Lecturer in Urdu at Kazi Nazrul University, Asansol, West Bengal. He received his B.A. and M.A. from The University of Burdwan, as well as Ph.D from the same Institue on the topic: "SeemabAkbarabadi ki Shairi ka TanqeediMotalya". He has qualified NET and was awarded JRF also bys the University Grants Commission. He has been interested in studying literature in Urdu and various languages. He has published several articles in various books, International Refereed Journals and Magazines on different topics in Urdu. Moreover, he presented papers in various International, National and State level Seminars on various topics in Urdu. He currently resides in Hooghly (W.B), and can be contacted on WatsApp Number: 7003242070 and email: rmansari5268@gmail.com.

Mr. Roudrajjal Dasgupta:

Mr. Roudrajjal Dasgupta completed his M.A. in Sociology from Pondicherry University. He worked as a Research Assistant in IIT, ISM Dhanbad in an ICSSR funded project "Transgender Tourism and Inclusivity in West Bengal" in 2018-19. He also worked as a Guest Lecturer in Government Girls' General Degree College, Kolkata, from 2019 to 2021. He also worked as a Junior Consultant and SRS Field Supervisor at the Office of the

Registrar General and Census Commissioner of India under the Ministry of Home Affairs in the Census 2021 Project. He is an independent researcher right now. His area of interests are Sociology of Cinema, Culture and Media; Fan Cultures, Gender and Sexuality, Comic Books Culture, Porn Studies, Erotic Culture, Superheroes Culture, and he is a film buff. Mr. Roudrajjal Dasgupta can be reached at Mobile: 6289024410 and email id: roudrajjal@gmail.com

Dr. Shabnam Parveen:

Dr. Shabnam Parveen received first class first and gold medal in M.A. from Calcutta University. She obtained UGC-NET fellowship (JRF) in 2002 and was awarded Ph.D. degree in 2007 from Calcutta University on the topic "Impact of Marxism on Urdu Novels". She joined West Bengal Educational Services in 2009 and currently working as an Assistant Professor of Urdu in Government Girls' General Degree College, Kolkata, West Bengal. In addition to teaching, she has keen interest in studying literatures in Urdu, Persian, English, Hindi and Bengali languages. She has published two books and 34 articles in various Indian magazines, journals and chapters in books in Urdu. Moreover, she presented more than 25 papers in various State level, National and International seminars. She organised more than 10 State level, National and International seminars in the College. She resides in Kolkata (W.B), and can be contacted at: drshabnamparveen151@gmail.com

Dr. Shafiqul Islam:

Shafiqul Islam is an Assistant Professor of Arabic at Government Girls' General Degree College, Ekbalpur, Kolkata, India. Current research interests of Shafiqul Islam includes Romanticism in Arabic Literature and he has also keen interest in translation: literary and journalistic.

Shafiqul Islam is a graduate in Arts with honours in Arabic, an M. A. in Arabic, an M. Phil. in Arabic from Jawaharlal Nehru University, New Delhi. He qualified UGC-NET and was awarded Junior Research Fellowship. After that he obtained Ph. D. in Arabic from the University of Calcutta. He joined West Bengal Education Services and posted at Maulana Azad College, Kolkata as an Assistant Professor of Arabic in 2014 and was transferred to Government Girls' General Degree College, Ekbalpur, Kolkata in 2016 which he is serving currently as an Assistant Professor.

He has authored thirteen research articles in Arabic and English and translated six Bengali poems into Arabic which have been published in international journals and also published one authored book, as well as he has presented papers in Arabic on various topics in international seminars. He currently resides in Kolkata and can be reached at: shafiqjnu@gmail.com

Dr. Syed Md Iqbal Shah Alquadri:

Dr. Syed Md Iqbal Shah Alquadri is presently working as the Head and Assistant Professor in the department of Persian, Maulana Azad College, Kolkata. He is also a Guest Faculty in the department of Arabic & Persian, University of Calcutta. He obtained the degree of Ph. D.

on his thesis entitled “Persian Studies in West Bengal (1947-2000 A.D) from the University of Calcutta in 2015. His area of specialization is “Mystical Persian Literature”. A number of his research articles have been published in reputed journals of India.

Dr. Syed Shah Wameequl Irshad Ali Alquaderi:

Dr. Syed Shah Wameequl Irshad Ali Alquaderi is a distinguished scholar in Urdu literature and working as a (SACT) in the Department of Urdu of Calcutta Girls' College. He was awarded the degree of Ph. D. by the University of Calcutta for his research on the life and contribution of 19th century Urdu poet Shams Kalkattawi. He worked as a Guest faculty member, Department of Urdu, Aliah University, Kolkata between 2015 to 2017. He was awarded "Raza Ali Wahshat Award" from West Bengal Urdu Academy in 1998 and "Shad Azimabadi Award" from Bihar Urdu Academy in 2008 for his academic performance. Dr.Alquaderi has published his Ph. D. thesis "Shams KalkattawiShakhs Aur Shayer" in the year 2022. He has also written two other books; “Manaquib-e- Tajedar-e- Aulia" in 2008 and “Mata-e- Aakhirat" in 2011. He is associated with various literary organisations in Kolkata and has participated in many national and international Seminars and his research articles have been published in reputed journals and magazines.

Dr. Syeda ShariqatulMoulaAlquadri:

Dr. Syeda ShariqatulMoulaAlquadri is the Principal of Government Girls’ General Degree College, Kolkata. She stood 1st Class 1st in her Master Degree and obtained

Gold Medal in Persian from the University of Calcutta. Dr.Alquadri was awarded the degree of Ph. D. by the University of Calcutta for her research on the life and works of a great Sufi of Bengal entitled "Hazrat Syed Shah Irshad Ali Alquadri, his contribution in Persian and Islamic studies". Her first appointment was in Lady Brabourne College, kolkata as a Lecturer in the Department of Persian in 2001. She was awarded National Scholarship, Outstanding Teacher Award, Shiksha Ratana Award and other prizes for her academic performance. She has participated in many national and international seminars and conferences and her research articles have been published in reputed journals and magazines.

Dr. Zahida Parween:

Zahida Parween is a State Aided College Teacher of Urdu. She completed her Graduation from Hooghly Mohsin College in 2003, passed M.A. from Maulana Azad National University in 2006 and received her Ph. D. in 2021 from Burdwan University. Apart from this, she also delivered special lecture series at Government Girls' General Degree College from 2018 to 2022. She has presented seminar papers at various places and many of her articles have been published in different journals. At present, she is serving as a State Aided College Teacher in Urdu Department of B.C. College Asansol. She can be reached at: Mobile no. 9330966467 and email: zahida.parween111@gmail.com .